الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

چھوٹے برتن میں زیادہ پانی نہیں سماتا
ٹھیک اسی طرح ـــــــــــــ
چھوٹے دل کے ساتھ بڑی کامیابی جمع نہیں ہوتی

اگست ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ ـ تین روپے □ شمارہ ۸۱

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

اگست ۱۹۸۳
شمارہ ۸۱

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

روزہ اور عید

روزہ ہماری دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور عید ہماری آخرت کی زندگی کی علامت۔ روزہ گویا امتحان ہے اور عید اس کا انجام۔ روزہ پابندیوں کا مرحلہ ہے اور عید آزادی کا مرحلہ۔ روزہ مشقت اور محنت کا دور ہے اور عید آرام اور خوشی کا دور۔

روزہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کی ساری زندگی طرح طرح کی پابندیوں میں گزرتی ہے۔ یہ کرو اور وہ نہ کرو، اِس وقت کھاؤ اور اُس وقت نہ کھاؤ، کب سوؤ اور کب بستر سے اٹھ جاؤ۔ غرض پورا ایک مہینہ اس طرح گزارا جاتا ہے گویا کہ آدمی کی پوری زندگی دوسرے کے قبضہ میں ہے۔ آدمی کو اپنی مرضی پر نہیں بلکہ دوسرے کی مرضی پر چلنا ہے۔ اس طرح روزہ آدمی کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی نگرانی میں دئے ہوئے ہو، وہ ہر معاملہ میں خدا کے حکموں کی پابندی کر رہا ہو۔

اس طرح کے ایک پرمشقت مہینہ کے بعد عید کا دن آتا ہے۔ عید کے دن اچانک تمام احکام بدل جاتے ہیں —— پہلے روزہ رکھنا فرض تھا، اب روزہ رکھنا حرام ہے۔ پہلے لازمی ضرورتوں تک پر پابندی لگی ہوئی تھی، اب کہدیا گیا کہ آزادی سے گھومو پھرو اور خوشیاں مناؤ۔ حتیٰ کہ غریبوں کے لئے صاحب حیثیت لوگوں پر صدقہ فطر مقرر کیا گیا تاکہ وہ بھی آج کے دن کی خوشیوں سے محروم نہ رہیں۔ یہ گویا آخرت کی زندگی کی ایک تصویر ہے۔ یہ اس دن کو یاد دلاتا ہے جب کہ خدا کے سچے بندوں پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں گی۔ وہ ابدی آرام اور ابدی خوشی کی جنتوں میں داخل کر دئے جائیں گے، خواہ آج وہ ظاہر بینوں کو کمزور اور بے قیمت کیوں نہ نظر آتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ اور عید ہماری زندگی کے دو مرحلوں کی یاد دلانے کے لئے ہیں۔ روزہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دنیا کے مرحلہ میں ہمیں کس طرح رہنا ہے۔ اور عید ہم کو بتاتی ہے کہ آخرت کے آنے والے مرحلہ میں ہماری زندگی کیسی زندگی ہوگی۔ ایک دنیا کی زندگی کی ابتدائی علامت ہے اور دوسری آخرت کی زندگی کی ابتدائی علامت۔

پانے کے باوجود محروم

چارلی چپلن (۱۹۷۷ - ۱۸۸۹) فلمی دنیا کا ایک مشہور ترین آدمی تھا۔ وہ فلموں میں ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس نے ۵۲ سالہ فلمی زندگی میں بے شمار دولت کمائی۔ چارلی چپلن ایک انگریز تھا۔ اس نے امریکہ میں فلمی ترقی حاصل کی اور پھر سوئزرلینڈ میں اس نے ۲۷ ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے لئے ایک شاندار مکان بنایا۔ جب وہ مرا تو اس کی ملکیت میں دس ملین پونڈ موجود تھے۔ اس کو بڑے بڑے انعامات اور خطابات سے نوازا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ چارلی چپلن کو دنیا کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی تقریباً ۸۰ فلمیں ایسی ہیں جو مسلسل کہیں نہ کہیں دکھائی جاتی ہیں۔ حتی کہ ۱۷-۱۹۱۴ میں اپنی ابتدائی زندگی میں اس نے جن فلموں میں کام کیا تھا وہ فلمیں بھی ابھی تک تاجرانہ حیثیت سے کامیاب ہیں۔ یہ ابتدائی فلمیں بھی آج محض تاریخی یادگار کے طور پر نہیں دکھائی جاتیں بلکہ جدید تفریح کے معیار سے ان کو دیکھا جاتا ہے۔ چارلی چپلن موجودہ زمانہ کا واحد فلمی کردار ہے جو اب بھی اتنے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں ۳۰۰ ملین ایسے لوگ ہیں جنہوں نے چارلی چپلن کی ۸۰ فلموں میں سے ایک ایک فلم کو دیکھا ہے۔

چارلی چپلن کی ابتدائی زندگی نہایت غربت میں گزری تھی۔ چنانچہ بعد کو کثیر دولت کا مالک ہونے کے باوجود اس کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ مفلس نہ ہو جائے۔ اس نے ایک کے بعد ایک چار شادیاں کیں۔ آخر عمر میں وہ بالکل ناکارہ ہو گیا۔ اس کی زندگی وہیل چیر (پہیہ دار کرسی) پر گزرتی تھی۔ اس کی نگاہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے بولنے اور سننے کی طاقتیں جواب دے گئی تھیں۔ حقیقی چارلی چپلن بستر پہ ناکارہ پڑا ہوا تھا۔ مگر فلمی چارلی چپلن بدستور سینما ہاؤسوں میں لوگوں کی تفریح کا مرکز بنا ہوا تھا۔

چارلی چپلن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اس نے کسی بھی دوسرے انسان کے مقابلہ میں زیادہ لوگوں کو زیادہ خوشی دی اور زیادہ ہنسایا" مگر اس کا اپنا انجام یہ ہوا کہ وہ آخر عمر میں اپنے بڑھاپے کو بے بسی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس کا ہنسنا اس سے رخصت ہو چکا تھا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ کو چار بجے صبح اس وقت اس کا انتقال ہو گیا جب کہ صرف چند گھنٹے بعد اس کا خاندان کرسمس کی سالانہ تقریبات منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

چارلی چپلن کے ایک سوانح نگار (ڈینس گیفرڈ (Denis Gifford) نے اس کے انجام کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں :

وہ جب کام کرتا تھا تو وہ محض فلم سے کچھ زیادہ کی تخلیق کرتا تھا۔ ہنسی اور محبت کے ساتھ جینا، خواب اور امیدیں۔ مگر ہمیشہ خوشیوں پر خاتمہ کہاں تھا، اگر بالآخر وہ کل کی سڑک پر قدم رکھنے سے زیادہ کچھ نہ ہو (آر۔ ڈی جون ۱۹۷۸)

چارلی چپلن کی موت کے بعد ایک مبصر نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے تھے :

Chaplin's life has been filled to the brim with what most lives consist of yearning after......wealth and fame and creative play and beautiful women......but he does not know how to enjoy any of the four.

Max Eastman in Ladies Home Journal

چارلی چپلن کی زندگی ان چیزوں سے آخری کنارے تک بھری ہوئی تھی جس کی دوسرے اکثر لوگ صرف تمنا کرتے ہیں ——— دولت، شہرت، تخلیقی اداکاری اور خوبصورت عورتیں۔ مگر اس کو نہیں معلوم تھا کہ ان چاروں میں کسی ایک سے بھی وہ کس طرح لطف اندوز ہو۔

چارلی چپلن کی یہ کہانی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ چارلی چپلن کی طرح پاکر محروم رہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ پائے بغیر محروم۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس سب سے بڑی حقیقت کو جانتے ہوں۔

امریکہ کی ایک نوجوان عورت نے خودکشی کرلی۔ اس کی جیب میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پرچہ تھا۔ اس میں درج تھا : مجھے خوشی کی تلاش تھی۔ اس کے لئے میں نے نشہ کا استعمال کیا۔ میں جنسی آوارگی کی حد تک گئی۔ مگر مجھے کہیں خوشی نہیں ملی۔ اب میں مایوس ہوکر اپنے آپ کو ختم کررہی ہوں۔

اکثر آزاد خیال مردوں اور عورتوں کا یہی حال ہے۔ وہ خوشی کی تلاش میں سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ مگر آخر میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کے بعد کچھ مایوسانہ زندگی گزار کر طبعی موت مرتے ہیں اور کچھ لوگ جھنجھلاہٹ میں آکر خودکشی کرلیتے ہیں۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

حقیقی ادب، خیالی ادب

اندر ملہوترا ٹائمس آف انڈیا کے مغربی نمائندہ ہیں۔ انہوں نے مسٹر ہرمن کی کتاب (جنگ کی ہوائیں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پچھلے پورے سال یہ کتاب اٹلانٹک کے دونوں کناروں پر سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں تقریباً سرفہرست رہی:

All through the last year, Mr. Herman's work The Winds of War remained close to the top of the weekly list of best-sellers on both sides of the Atlantic.

"اٹلانٹک کے دونوں کنارے" سے مراد یورپ اور امریکہ ہیں۔ یہ ایک خوبصورت ادبی اسلوب ہے۔ مگر یہ ادبی اسلوب واقعہ کی بنیاد پر بنا ہے۔ اس کے بالمقابل خیالی ادب ہے جس کے لئے واقعہ سے مطابقت ضروری نہیں۔ مثلاً شبنم ایک مادی واقعہ ہے۔ اس کا ایک معلوم طبیعی مفہوم ہے۔ مگر شاعر جب اپنے خیالات کی دنیا میں ایک تصویر بناتا ہے تو اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ شبنم فی الواقع کس چیز کا نام ہے۔ وہ اگر اپنے فرضی محبوب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا ہو تو وہ کہے گا:

صبا نے وہ تگ و دو کی ہے اعلان مسرت میں   کہ ٹپکا ہے پسینہ جا بجا شبنم کی صورت میں

اس کے برعکس اگر شاعر کے فرضی محبوب کا انتقال ہو جائے تو یہی شبنم "گریہ شبنم" میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت شاعر کو دکھائی دیگا گویا شبنم کے قطرے آسمان کے آنسو ہیں جو شدت غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے نکل پڑے ہیں۔

امریکی خلاباز مسٹر نیل آرم اسٹرانگ نے ۱۹۶۹ میں جب پہلی بار چاند پر قدم رکھا تو ان کی زبان سے نکلا — یہ ایک آدمی کے لئے ایک چھوٹا قدم ہے مگر انسانیت کے لئے وہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for a man, one giant leap for mankind

یہ جملہ ایک عظیم سفر کے بعد نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم حالات ہی عظیم ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ جس آدمی نے بے شمار مراحل سے گزر کر ایسا قدم اٹھایا ہو جو فی الواقع انسانیت کے لئے ایک چھلانگ بننے والا ہو وہی وہ شخص ہوتا ہے جس کے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں جس کا ایک نمونہ مسٹر آرم اسٹرانگ کے جملہ میں نظر آتا ہے۔ فرضی تخیل سے فرضی ادب پیدا ہوتا ہے اور حقیقی عمل سے حقیقی ادب۔

پانچ سکنڈ کا فاصلہ

۳ جون ۱۹۷۹ کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی صدر بازار کی سڑک پر ایک ساتھ جا رہے تھے۔

اس کے بعد اچانک ایک واقعہ ہوا۔ ہمارے سامنے ایک مکان کے آگے کا حصہ دھماکہ کے ساتھ گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ اس وقت ہم دونوں جائے حادثہ سے بمشکل پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ ہمارا سفر شاید درمیان ہی میں ختم ہو جاتا جس کی منزل ہم نے بہت آگے سمجھ رکھی تھی۔

میں نے سوچا۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لئے ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ اس کا پانچ سکنڈ کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی اگر اچھی طرح اس بات کو جان لے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بالکل بدل جائے۔ وہ ایک اور ہی قسم کا انسان بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ایسی موت جس کے مابعد آدمی، حدیث کے الفاظ میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔ مگر انسان اتنا بے حس بنا ہوا ہے کہ اس کو اس کی خبر نہیں۔

لوگ جھوٹی خدا پرستی پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ آخرت میں صرف حقیقی خدا پرستی کسی شخص کے کام آئے گی۔ حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ اس کے ذہن پر چھا جائے، وہ اس کے صبح و شام کا نگراں بن جائے۔ وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے۔ اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔

لندن میں چند روز

باربیڈوز جاتے ہوئے میں چند دن کے لئے لندن میں ٹھہرا۔ لندن میں میرا قیام ۲۲ مارچ کی شام سے لے کر ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کی صبح تک رہا۔ اس دوران میں جو مشاہدات و تاثرات سامنے آئے، ان کو مختصراً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

لندن کے ہوائی اڈہ ہیتھرو پر میں اترا تو آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی پچھلے دن آسمان کھلا ہوا تھا اور گرمی کا سا موسم ہو رہا تھا کہ اچانک برسات جیسا موسم ہو گیا۔ یہ انگلستان کی عام موسمی خصوصیت ہے۔ یہاں کا موسم تقریباً سال بھر غیر یقینی رہتا ہے۔ وہ بار بار اچانک طور پر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے موسم کو ادبی زبان میں نقص خائن (Treacherous Weather) کہتے ہیں۔ ابھی گرمی تھی، ابھی ٹھنڈ آ گئی۔ ابھی آسمان کھلا ہوا تھا، ابھی بادل چھا گیا۔

انگریز قوم کو بار بار اپنے آپ کو موسم کے موافق بنانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انگریزی قوم میں حیرت انگیز طور پر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت جلد اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے موافق کر لیتی ہے۔ اور اس طرح اپنے مفادات کو محفوظ رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس نے استعماری نظام کے خاتمہ کے بعد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی قوم کی اس مفاہمانہ خصوصیت کی کم از کم ایک وجہ، موسموں کی مذکورہ حالت بھی ہے جس نے انہیں زندہ رہنے کے لئے حالات سے موافقت کا سبق دیا۔ ایک انگریز عام طور پر خلاف مزاج بات پر مشتعل نہیں ہوتا۔ وہ گرم بات کا بھی ٹھنڈے طریقہ سے استقبال کرتا ہے۔ انگلستان کی موسمی صورت حال نے انگریزوں کی اخلاقیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

میں ۲۲ مارچ کو لندن پہنچا تو اس کے صرف ایک دن پہلے سر رچرڈ اٹن برو کی فلم "گاندھی" کو برٹش اکیڈمی کا خصوصی انعام دیا گیا تھا۔ اور اس کی شاندار تقریب منائی گئی تھی۔ اس فلم کو نہ صرف ہندستان میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہیروآف پیس (Hero of Peace) کی زندگی کو دیکھنے کی خاطر بے پناہ لوگ سنیما ہاؤس کی کھڑکیوں پر ٹکٹ لینے کے لئے لمبی لمبی لائن لگا رہے ہیں۔ امریکہ میں یہ فلم اب تک ۳۰ ملین

ڈالر حاصل کر چکی ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کا خیال ہے کہ ملک کی آزادی میں انہوں نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے بطور خود اپنے قائدین کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے سیاسی الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ رئیس الاحرار، بطل حریت، شیخ الہند، امام الہند، وغیرہ۔ مگر ہمارے اپنے محدود خول کے باہر آزادیٔ ہند کی جو تاریخ مرتب ہو رہی ہے اس میں سارا مقام ان لوگوں کو مل رہا ہے جن کے نام کے ساتھ اس قسم کے شاندار القاب شامل نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی کم از کم ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ہماری جھنجھلاہٹ دراصل ہماری خوش خیالیوں کی قیمت ہے۔ اگر آپ فرضی طور پر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیں اور دنیا آپ کی بڑائی کو نہ مانے تو اس کے بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہی ہے کہ آپ دوسروں کو عدم اعتراف کا ملزم قرار دے کر دوسروں سے نفرت کرنے لگیں گے —— پچھڑاپن صرف ایک کمی ہے۔ مگر خوش خیالی ایک جرم ہے جس کی فرد اور قوم دونوں کو بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔

دہلی سے میں فجر کی نماز پڑھ کر چلا تھا۔ اور ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے لندن پہنچ کر ادا کیں۔ حالانکہ دہلی سے لندن کا سفر تقریباً چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی اور لندن کے اوقات میں تقریباً ۵ ½ گھنٹے کا فرق ہے۔ دہلی والوں کے لئے دن بڑا نہیں ہوا۔ اور نہ وہ لندن والوں کے لئے بڑا ہوا۔ البتہ میرے لئے بڑا ہو گیا۔ کیونکہ میں دہلی کی فضا سے نکل کر اسی دن لندن کی فضا میں پہنچ گیا۔ جہاں شام کا وقت دہلی کے مقابلہ میں ۵ ½ گھنٹہ بعد آتا ہے۔ ایک شخص دہلی سے نکلے اور اسی دن وہ لندن پہنچ جائے تو قدرتی طور پر اس کے لئے اس وقت بھی دن ہوگا جب کہ دہلی والوں کے لئے شام آچکی ہوگی۔

یہ ایک علامت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے اتنے زیادہ امکانات رکھے ہیں کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اس وقت بھی اجالے میں ہوں جب کہ دوسروں پر رات کا اندھیرا چھا چکا ہو۔

جہاز کے اندر لندن کا اخبار ٹیلی گراف پڑھنے کو ملا۔ اس کا روزانہ ایڈیشن ۲۸ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور سنڈے ایڈیشن ۴۰ صفحات پر۔

ڈیلی ٹیلی گراف (۲۲ مارچ ۱۹۸۳) میں یہ خبر درج تھی کہ ایک مسلم خاتون (مسز محمودہ پٹیل) جن کی عمر ۳۰ سال ہے انہوں نے اپنے ایک مرض کے سلسلے میں لندن کے ایک ڈاکٹر کا علاج کرایا۔

ڈاکٹر نے غلط تشخیص کی اور غلط دوا دیدی جس کی وجہ سے ان کا ایک بازو جزئی طور پر مفلوج ہوگیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ چنانچہ لندن ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ مسز پٹیل کو ڈاکٹر کی طرف سے ۸۵۰۰۰ پونڈ ہرجانہ دلائے جائیں۔

اس اخبار میں دوسری خبر یہ تھی کہ ایک نوجوان (Michael Robinson) جس کی عمر ۲۵ سال ہے، وہ ایک فارم میں کام کرتا تھا۔ وہاں زرعی مشین سے اس کے سر میں چوٹ آگئی اور اس کا دماغ متاثر ہوگیا۔ اس نوجوان نے بھی مقدمہ دائر کیا۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اس نوجوان کو تلافی کے لئے ۲۲۰۰۰۰ پونڈ ادا کئے جائیں۔

اس طرح کے واقعات ہمارے ملک میں روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ایسے مصیبت زدگان کا ہمارے یہاں جو انجام ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب جب حضرت مسیح دنیا میں آئیں گے تو وہ دمشق کی جامع مسجد کے منارہ پر اتریں گے اور کہیں گے کہ سیڑھی لاؤ۔ اس کے بعد سیڑھی لگائی جائے گی۔ اور وہ اس کے ذریعہ سے اتر کر زمین پر قدم رکھیں گے۔ آسمان سے اتر کر مسجد کے منارہ پر ٹھہرنا اور سیڑھی مانگنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ جب میں ہوائی جہاز کا سفر کرتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ ہوائی جہاز چالیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آکر ہوائی اڈہ پر اترا اور پھر اس کے بلند دروازوں پر مخصوص قسم کی اونچی سیڑھیاں لگائی گئیں تاکہ مسافر اس کے ذریعہ سے زمین پر اتریں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث تمثیلی زبان میں تو نہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ حضرت مسیح ہوائی جہاز کے دور میں آئیں گے۔

آپ اپنے مقام سے مشرق کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کریں تو دن آپ کے لئے چھوٹا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کرتے ہیں تو دن آپ کے لئے بڑا ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کی طرف ہوائی جہاز سے لمبا سفر کرکے جب آپ اپنی اگلی منزل پر پہنچتے ہیں تو اس وقت بھی دن آپ کے لئے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ کے اپنے مقام پر وہ ڈوب چکا ہوتا ہے۔ حتی کہ آپ اپنے سابق مقام پر مغرب کی نماز پڑھ کر مغرب کی سمت تیز رفتار سفر کریں تو اگلی منزل پر پہنچ کر سورج آپ کو دوبارہ نکلا ہوا دکھائی دے گا ——— عمل کے ذریعہ آدمی وقت کے اوپر بھی غالب آجاتا ہے۔

لندن کا اخبار ٹائمس ۳۲ صفحات پر نکلتا ہے۔ اس کی ۲۵ مارچ ۱۹۸۳ کی اشاعت میں ایک باتصویر خبر صفحہ اول پر درج تھی جس کی مزید تفصیلات نے صفحہ ۲۰ کے تہائی حصہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ خبر کا عنوان تھا :

Gurinder Singh Mandla: Broke school rules

ایک سکھ نوجوان گورندر سنگھ منڈلا (۱۸ سال) پارک گروو اسکول (برمنگھم) میں پڑھتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر لی (Audley Dowell Lee) نے اس کی پگڑی پر اعتراض کیا۔ کیونکہ وہ اسکول یونیفارم کے خلاف تھا۔ سکھ طالب علم نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر نے اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا۔

اس کیس کو فیڈریشن آف سکھ آرگنائزیشن نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے اس پر پچاس ہزار پونڈ خرچ کئے اور پانچ سال تک مقدمہ لڑتے رہے۔ وہ عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم وہ ہمت نہیں ہارے۔ اب انہوں نے اپنا مسئلہ برطانیہ کے ہاوس آف لارڈز میں پیش کیا۔ ہاؤس آف لارڈز نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ دیا کہ برطانیہ کے قانون نسلی تعلقات (Race Relations Act) کے تحت سکھ طالب علم کو پگڑی پہننے سے روکا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ ان کے خلاف ایک امتیاز (Discrimination) کا معاملہ ہوگا۔ اس فیصلہ سے ان تمام سکھوں کو فائدہ پہنچے گا جو دو لاکھ پچاس ہزار کی تعداد میں برطانیہ میں آباد ہیں۔

انگریز اپنی روایات کے بے حد پابند ہیں۔ وہ اسکول یونیفارم کے معاملہ میں اس قسم کی خلاف ورزی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ مگر قانون کی موجودگی میں وہ دھاندلی کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سخت ناپسندیدگی کے باوجود انہوں نے سکھوں کو یہ اجازت دیدی کہ وہ اسکول یونیفارم کی خلاف ورزی کریں۔ اور پگڑی پہن کر اسکول میں آئیں۔ اصول کو نہ توڑنے کا یہی مزاج ہے جو کسی قوم کو کرپشن سے بچاتا ہے۔ اصول کو توڑنا روایت کو توڑنا ہے۔ اگر آپ غیروں کی ضد میں اصول توڑیں تو اپنوں کے درمیان بھی آپ اصول کا احترام باقی نہیں رکھ سکتے۔

انگریزوں نے جب عراق پر قبضہ کیا تو اس زمانہ کا ایک لطیفہ ہے جو انگریزی قوم کے مزاج کو بہت خوبی کے ساتھ بتاتا ہے۔ سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) بصرہ میں انگریز گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صبح کے وقت قریب کی مسجد سے موذن نے فجر کی اذان دی۔ سر پرسی کاکس کے لئے یہ نئی آواز تھی۔ اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتایا گیا کہ یہ

مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ ہر نماز کے وقت نمازیوں کو باخبر کرنے کے لئے اس قسم کی اذان دیتے ہیں۔ سر پرسی کاکس نے کہا:

"اس سے ہمارے امپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں"

کہا گیا کہ نہیں۔ اس نے کہا، پھر انہیں کرنے دو جو وہ کر رہے ہیں۔

اس سے انگریز قوم کا مزاج معلوم ہوتا ہے اور غالباً ان کا یہ مزاج بھی سکھوں کو پگڑی کا حق دینے کا سبب ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے نو آبادیاتی دور میں انگریزوں کے اس مزاج کو استعمال نہیں کیا۔ مثلاً اگر وہ غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تو انگریز قطعاً اس میں رکاوٹ نہ ڈالتے۔ بلکہ تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہے کہ انگریزوں نے خود یہ چاہا کہ مسلمان سیاسی لڑائی چھوڑ کر تعلیم اور تبلیغ کے کام میں لگ جائیں۔ جس میں ان کے نزدیک ان کی امپائر کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان اس موقع کو استعمال کرتے تو آج یقینی طور پر تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ جس عمل کو انگریز اپنے امپائر کے لئے بے خطر سمجھتا تھا، اسی میں سارے باطل امپائر کی موت چھپی ہوئی تھی لیکن مسلم لیڈروں کو سب کچھ معلوم ہے مگر یہی اہم ترین بات ان میں سے کسی کو نہیں معلوم۔

مسلم قوموں کا تقابل اگر موجودہ زمانہ کی مغربی قوموں سے کیا جائے تو ایک عجیب فرق نظر آئے گا۔ مغربی قوموں میں حقیقت پسندی ہے اور مسلم قوموں میں جذباتیت۔ یہ فرق اتنا زیادہ عام ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ ادب، سیاست، معاشرت، اقتصادیات، تعلیم، غرض کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جدید دور میں مغربی قوموں کا مزاج سائنس کی فضا میں بنا اور مسلمانوں کا مزاج سیاست کی فضا میں۔ اور یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ سائنس حقیقت پسندی پیدا کرتی ہے اور سیاست جذباتی ہنگامہ آرائی۔

ہم میں سے جن لوگوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں، ان کو ہندستان کی تقسیم سے پہلے کے وہ مناظر اچھی طرح یاد ہیں جب کہ "تقسیم ہند" کو مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل سمجھ لیا گیا تھا۔ اقبال اس نظریہ کو پیش کرنے کے نتیجہ میں مفکر اعظم اور محمد علی جناح اس کو لیکر اٹھنے کی بنا پر قائد اعظم بن گئے تھے۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب پڑھنے کو ملی جس میں اس گزرے ہوئے دور کا

ایک عبرت ناک ورق موجود تھا۔ یہ ورق یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں "پاکستان" کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مسٹر جناح اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

> The problem in India is not of an inter-communal character but manifestly of an international one, and it must be treated as such. So long as this basic and fundamental truth is not realized, any constitution that may be built will result in disaster and will prove destructive and harmful not only to the Musalmans but to the British and Hindus also. If the British government are really in earnest and sincere to secure peace and happiness of the people of this sub-continent, the only course opened to us all is to allow the major nations separate homelands by dividing India into 'autonomous national states.' There is no reason why these states should be antagonistic to each other. On the other hand, the rivalry and the natural desire and efforts on the part of one to dominate the social order and establish political supremacy over the other in the government of the country will disappear. It will lead more towards natural goodwill by international pacts between them, and they can live in complete harmony with their neighbours. This will lead to further a friendly settlement all the more easily with regard to minorities by reciprocal arrangments and adjustments between Muslim India and Hindu India, which will far more adequately and effectively safeguard the rights and interests of Muslims and various other minorities

"ہندستان کا مسئلہ دو فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ دو قوموں کا مسئلہ ہے، اور اس کو اسی طرح حل کیا جانا چاہئے۔ اس بنیادی حقیقت کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک جو دستور بھی بنایا جائے گا وہ تباہ کن ہوگا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے نقصان کا باعث ہوگا بلکہ برطانیہ اور ہندوؤں کے لئے بھی۔ برطانی حکومت اگر فی الواقع اس برصغیر کے لوگوں کو امن اور خوشی دینا چاہتی ہے تو ہم سب کے لئے ایک ہی کھلا ہوا راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ملک کو آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو علیٰحدہ وطن دیدیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ ریاستیں کیوں ایک دوسرے کی مخاصم ہوجائیں گی۔ اس کے بجائے یہ ہوگا کہ اس کے بعد باہمی رقابت اور ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ اور ایک دوسرے پر سیاسی برتری حاصل کی خواہش ختم ہوجائے گی۔ اس طرح کی تقسیم ان کے درمیان مزید بین اقوامی معاہدات کے ذریعہ باہم اچھے تعلقات کا سبب ہوگی۔ اور وہ کامل ہم آہنگی سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہیں گی۔ اس کے بعد زیادہ آسانی کے ساتھ یہ ممکن ہوجائے گا کہ اقلیتوں کے بارہ میں دوطرفہ بنیاد پر دوستانہ معاملہ کیا جاسکے اور مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے درمیان بہتر تعلقات قائم

کئے جاسکیں جو زیادہ مناسب اور زیادہ موثر طور پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گا۔ ۱۱

اس تقریر کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ جن خوبصورت الفاظ پر چالیس سال پہلے پوری قوم کی قوم دوڑ پڑی تھی وہ الفاظ حقیقتِ واقعہ سے کتنا زیادہ دور تھے ۔ لندن میں میری ملاقات بہت سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں سے ہوئی۔ سب سے زیادہ عجیب بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ آزاد اور مدنی کے سیکولر ہندستان اور اقبال اور جناح کے اسلامی پاکستان سے زیادہ یہ لوگ انگریزوں کے لندن میں اپنے آپ کو محفوظ اور کامیاب سمجھتے ہیں ، وہی انگریزوں کا لندن جس کو دونوں گروہوں نے مشترک طور پر جہنم فرض کرلیا تھا اور اپنے خوابوں کے دیس کو اپنے لئے جنت یقین کر رکھا تھا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رچرڈ نکسن نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے قائدین (Leaders) اس کتاب میں بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ مصنف نے ہندستان اور پاکستان کے لیڈروں کے بارہ میں بھی اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جنگ عظیم ثانی کے بعد کی تاریخ میں بے معنی فوجی اخراجات کی سب سے زیادہ الم ناک مثالوں میں سے ایک وہ ہے جو ہندستان اور پاکستان کے جھگڑے کی صورت میں پائی جاتی ہے :

> The Indo-Pakistani conflict was one of the most tragic examples of senseless military spending in post-war history.

رچرڈ نکسن کے الفاظ خواہ ہمیں کتنے ہی ناپسند ہوں ۔ مگر یہ خود ہمارے اپنے لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں ۔ ہندستان اور پاکستان کے موجودہ حالات اگر ایسے نہ ہوتے تو امریکہ کے سابق صدر کو یہ کہنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی ۔

یہاں جو ایشیائی مقیم ہیں ان کے دو سب سے بڑے مسئلے ہیں ——— مقامی باشندوں کا انہیں حقیر سمجھنا ۔ اور اپنے بچوں کے بارہ میں ان کی بے بسی ۔

انگریز قوم بے حد متحمل مزاج قوم ہے ۔ اس لئے بہت زیادہ کھلے طور پر ایشیائیوں سے اس کی بیزاری کا اظہار نہیں ہوتا ۔ مگر روزمرہ کی زندگی میں ایشیائیوں کو بار بار اس کا تلخ تجربہ اٹھانا پڑتا ہے ۔ مثلاً ایک ایشیائی خاندان کا بچہ ایک روز باہر سے آیا اور غم زدہ ہو کر اپنی ماں سے بولا "ممی انگریز بچے ہم کو بلیک (کالا) کیوں کہتے ہیں ۔ ہم بلیک تو نہیں ہیں " ایک صاحب جنہوں نے

انگریز خاتون سے شادی کی ہے۔ ان کے اپنے بچے جب خفا ہوتے ہیں تو اپنے والد کو کہتے ہیں "بلیک"

جو بچے یہاں پیدا ہوئے ہیں وہ انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ انگریزی ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف انگریزی میں بول سکتے ہیں وہ اپنے والدین کی زبان نہیں جانتے۔ والدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں سے اپنی مادری زبان میں بات نہیں کرسکتے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے جو یہاں کا پورا ماحول انہیں سکھا رہا ہے۔ موجودہ مغرب کا خاص مزاج ہے اپنے آپ سے باہر کسی اتھارٹی کو نہ ماننا۔ بچے یہاں کی فضا میں ہر وقت یہی سبق سیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف خدا و رسول سے منحرف ہو رہے ہیں بلکہ اپنے ماں باپ کی بات ماننے کو اپنی انفرادی آزادی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ صفائی سے کہتے ہیں کہ دوسرا کوئی شخص ہمارے اوپر پابندی کیسے لگا سکتا ہے۔ ہم جو کچھ کریں گے اپنی سمجھ سے کریں گے نہ کہ دوسرے کی سمجھ سے۔

کچھ ایشیائی خاندان مقاومت کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سے خاندانوں نے حالات سے مصالحت کرلی ہے۔ ایک دیندار خاندان کی بچی جو اپنے گھر میں یہ سنتی تھی کہ صرف ذبیحہ کا گوشت کھانا چاہیئے۔ اس سے اسکول میں ایک دوسرے مسلمان خاندان کی بچی نے کہا کہ ہم لوگ ذبیحہ اور غیر ذبیحہ کا فرق نہیں کرتے۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو بازار میں ملتا ہے۔ پہلے خاندان کی بچی اپنے گھر آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا "ممی آپ ہم لوگوں کو غیر ذبیحہ کا گوشت کھانے سے منع کرتی ہیں۔ حالانکہ فلاں مسلمان گھر کے لوگ غیر ذبیحہ کا گوشت کھاتے ہیں۔ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں۔ کیا ہمارا اسلام دوسرا ہے اور ان کا اسلام دوسرا"

ایشیائی لوگ مغربی ملکوں میں زیادہ کمائی کے لئے جاتے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ محنتی آدمی اپنے ملک میں بھی کافی کمائی کرسکتا ہے۔ اگرچہ یہ فرق ضرور ہے ہے کہ باہر جو کچھ کم محنت کرکے مل جاتا ہے اس کو اپنے ملک میں پانے کے لئے زیادہ محنت کا ثبوت دینا ہوگا۔

البتہ مغربی ملکوں میں ایک خاص چیز ہے جو ہندستان جیسے ملکوں میں موجود نہیں۔ اور وہ ہے معاملات میں دیانت داری۔ ایک صاحب نے لندن کی ایک دکان سے جوتا خریدا۔ جوتا پہلے ہی استعمال میں پھٹ گیا۔ ان کے پاس خریداری کی رسید محفوظ نہ تھی۔ تاہم انھوں نے جوتا کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کو خط لکھا۔ اس کے جواب میں ان کے پاس جو معذرت نامہ آیا اس کے ساتھ لفافہ میں پوری قیمت کا بینک چک بھی موجود تھا۔

یہاں پیدائش کے بعد فوراً ہی بچہ کو حکومت سے وظیفہ لینے کا حق ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ بچہ ایک ایسے ماں باپ کا ہو جو یہاں اپنے ملکی پاسپورٹ پر مقیم ہیں۔ آپ کو صرف ایک بار ضروری فارم لینے کے لئے متعلقہ دفتر جانا پڑے گا۔ آپ فارم پر کر کے بھیج دیجئے اور ڈاک سے آپ کے یہاں ہر مہینہ چک کے ذریعہ وظیفہ کی رقم آتی رہے گی۔ لندن کے لوگ اگرچہ ایشیائی لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر قانونی طور پر ان کے جو حقوق ہیں ان کو دینے میں کبھی ان کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ایشیائیوں سے امتیازی سلوک کرنا اپنے نظام کو خراب کرنے کی قیمت پر ہوگا، اور وہ پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کی ضد میں خود اپنے نظام کو خراب کر لیں۔

ایشیائی لوگوں سے امتیاز کی بات مجھ سے یہاں کے کچھ ایشیائی لوگوں نے کہی۔ اس کے بعد میں نے اس کا ذکر ایک انگریز سے کیا۔ اس نے کہا کہ یہ جنرلائزیشن ہے۔ یعنی جزئی واقعات کو عمومی واقعات بنا دیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ انگریزوں کے اندر نسلی تعصب نہیں پایا جاتا۔ عام انگریز ایشیائی لوگوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے وہ خود اپنے درمیان ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔ پرانے انگریز جنہوں نے نوآبادیاتی زمانہ دیکھا ہے ان میں کچھ احساس برتری ضرور ہے۔ مگر نئی نسل کے نوجوانوں میں ایسا بالکل نہیں۔

میں اب تک جن جن ملکوں میں گیا ہوں، ان میں کم از کم ایرپورٹ پر مجھے سب سے زیادہ بہتر اخلاق کا ثبوت لندن میں ملا ہے۔ مثلاً نیویارک کے ایرپورٹ پر جن امریکی نوجوانوں سے میرا سابقہ پیش آیا ان میں سے اکثر کے اندر میں نے احساس برتری کی جھلک دیکھی۔ مگر لندن کے ہوائی اڈہ پر جو انگریز نوجوان ڈیوٹی پر متعین تھے۔ انھوں نے ہمیشہ نرمی اور شرافت کا ثبوت دیا۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انڈیا اور انگلستان کے درمیان تعلقات دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ گہرے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ہندستان اور بیرونی دنیا کے درمیان ٹیلی فون کا ربط سب سے پہلے انگلینڈ کے واسطہ سے قائم ہوا۔ ایشیا اور یورپ کے یہ دو اہم ملک یکم مئی ۱۹۳۳ کو ٹیلی فون کے ذریعہ مربوط ہوئے۔ آج بھی یہ حال ہے کہ ہندستان سے بیرونی ٹیلی فون ٹرافک کا تقریباً چالیس فی صد حصہ لندن ہو کر گزرتا ہے۔

اس ٹیلی فونی ربط کی پچاس سالہ تقریب ۳ مئی ۱۹۸۳ کو لندن اور نئی دہلی میں بیک وقت منائی گئی۔ اس موقع پر تقریب کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے وزیر اعظم انگلستان مسز مارگریٹ تھیچر سے ٹیلی فون پر بات کی۔

ہندستان میں زندہ رہنے کے لئے آدمی کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ـــــ قوت خـــریداری اور خریدی جانے والی چیز کے بارہ میں جانکاری ۔ چونکہ زندگی کی ضروریات بے شمار ہیں ۔ آدمی کو کمانے اور قوت خرید حاصل کرنے میں اتنا مصروف ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر چیز کے بارہ میں جانکاری حاصل نہیں کرسکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں خریدار کو بار بار دھوکا کھانا پڑتا ہے ۔ وہ اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسہ کو بازار میں اس طرح دے دیتا ہے کہ اس کے بدلے میں اس کو ایسی چیز ملتی ہے جو چند دن کے استعمال کے بعد صرف اس کے مکان کے کباڑ میں اضافہ کرے ۔

لندن میں اور مغرب کے دوسرے شہروں میں یہ مسئلہ نہیں ہے ۔ یہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے ۔ اور وہ یہ کہ آپ محنت کرکے کمائیں ۔ اگر آپ کے پاس رقم ہے تو آپ بازار سے اس اطمینان کے ساتھ خریداری کرسکتے ہیں کہ آپ جو چیز حاصل کرنا چاہتے تھے وہی چیز آپ نے پائی ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز ۔ حتی کہ اگر آپ کے پاس بازار جاکر خریداری کرنے کا وقت نہیں ہے تو آپ اپنی ضرورت کی ہر چیز ٹیلی فون پر منگا سکتے ہیں ۔ اور اس طرح منگائی ہوئی چیز بھی دوبارہ عین آپ کی مرضی کے مطابق ہوگی ۔

مغربی قوموں میں یہ چیز غالباً سائنسی روایات سے آئی ہے ۔ سائنس حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خصوصیات بلاشبہہ حقیقت پسندی کے مختلف نتائج ہیں ۔

۲۵ مارچ کو لندن میں میری قیام گاہ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رشید صدیقی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں ۔ موصوف یو کے اسلامک مشن (لندن) کے صدر ہیں ۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے یہاں میرا پروگرام رکھنا چاہتے ہیں ۔ میں نے رضامندی دیدی ۔ لندن سے میری روانگی ۲۹ مارچ کو تھی ، اس لئے یہ طے ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۹۸۳ کی شام کو پروگرام رکھا جائے ۔

یو کے اسلامک مشن کا صدر دفتر لینڈس ڈاون روڈ (لندن) میں قائم ہے ۔ اس کے علاوہ انگلستان میں اس کی ۳۵ شاخیں ہیں ۔ مرکزی دفتر میں کچھ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے ۔ جن سے سوال وجواب کی صورت میں بات چیت ہوئی ۔ مختلف دینی موضوعات زیر بحث آئے ۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ جہالت ہے ۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوجائیں تو ان کے اکثر مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے ۔ یہ سن کر ایک نوجوان نے کہا :

مغرب میں تو تعلیم بہت عام ہے ۔ مگر یہاں کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے ۔ چنانچہ

یہاں کے لوگ اب De-learning کی بات کرنے لگے ہیں۔ وہ اب سوچ رہے ہیں کہ بے تعلیمی شاید زیادہ بہتر طور پر انسانی مسائل کو حل کرے گی"

مذکورہ مسلم نوجوان انگلستان کے ایک انگریزی پرچہ میں کام کرتے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ آپ جو اپنے وطن سے آکر یہاں رہ رہے ہیں تو کیا یہاں آپ اپنی بے علمی کی قیمت پا رہے ہیں۔ اگر بے علمی مسئلہ کا حل ہو تو آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بے علم بنانا چاہیے۔ مگر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے علم کو نمبر ایک اہمیت دئے ہوئے ہیں اور ملت کے بچوں کو وہ بے علمی کا سبق دے رہا ہے۔ یہی غیر سنجیدگی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام مسائل پیدا کئے ہیں۔

مصر کے سابق صدر جمال عبد الناصر کے بارہ میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک تقریر میں اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا نحن ابناء الفراعنه سنرمیکم فی البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) لندن میں معلوم ہوا کہ یہ سراسر یہودیوں کی اختراع تھی۔ انہوں نے خود سے اس کو وضع کرکے اس کو مشہور کر دیا تاکہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کا جواز فراہم ہو سکے۔

انگلستان کے ایک مورخ ارسکن چائلڈرس (Erskine Childers) نے یہودیوں کی اکاذیب پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں صدر ناصر کے مذکورہ فقرہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی تحقیق ناصر کی زندگی میں شروع کی تھی۔ اس نے جب اخبارات میں یہ رپورٹ پڑھی تو اس نے صدر ناصر کو خط لکھا کہ آپ نے یہ بات اپنی کس تقریر میں کہی ہے۔ ناصر نے لکھا کہ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے کبھی یہ بات کہی ہو۔ تاہم میں نے اپنے عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ میری تمام تقریروں کا جائزہ لے۔

ناصر کی تمام تقریروں کا ٹیپ موجود تھا، وہ سب کا سب دوبارہ سنا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سراسر گھڑی ہوئی بات ہے۔ ورنہ ناصر نے کبھی ایسی بات نہیں کہی، یہودیوں نے اپنے سیاسی مقصد کے تحت یہ جھوٹ گھڑا۔ اور مسلمانوں کا حال چونکہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے بارہ میں ہر الٹی بات کو فوراً مان لیتے ہیں۔ چنانچہ جو صدر ناصر کے مخالف تھے وہ اس کو لے اڑے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی کتاب میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

راقم الحروف جمال عبد الناصر کا کسی درجہ میں بھی حامی نہیں۔ مگر کسی آدمی کی طرف وہی

بات منسوب کرنی چاہیئے جو فی الواقع اس نے کی ہو یا کہی ہو۔ مثلاً جمال عبدالناصر نے ۱۹۵۵ میں نہر سوئز کو نیشنلائز کیا میں اس کو سراسر حماقت سمجھتا ہوں۔ اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے سوا اس کا کوئی وجہ جواز نہیں۔ نہر سوئز ایک بین اقوامی معاہدہ کے تحت برطانیہ اور فرانس کے زیر انتظام تھی۔ یہ معاہدہ صرف چند سال بعد ختم ہونے والا تھا۔ اگر ناصر صبر کرتے تو چند سال بعد وہ اپنے آپ ختم ہو جاتا، مگر ناصر نے اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے لئے غیر ضروری طور پر قبل از وقت اس کو نیشنلائز کیا اور اس کی قیمت مصر کو بہت بڑی تباہی کی صورت میں بھگتنی پڑی۔

ہانگ کانگ کو برطانیہ نے پٹہ پر چین سے لیا تھا۔ اس کی مدت ۱۹۹۷ میں ختم ہونے والی ہے۔ چینی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے ہیں کہ جب یہ مدت ختم ہو تو معاہدہ کی تجدید نہ کرکے دوبارہ ہانگ کانگ پر اپنا قبضہ بحال کرلیں۔ اسی طرح کیوبا میں ایک جزیرہ سابق معاہدہ کے تحت امریکی فوج کے قبضہ میں ہے۔ اس کو بھی وہاں کا موجودہ حکمراں کیسترو برداشت کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ امریکہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ چند سال بعد جب معاہدہ کی مدت ختم ہو تو اس کی تجدید سے انکار کر دے اور اس طرح امریکی فوجوں کو واپس بھیج دے۔ مگر جمال عبدالناصر نے انتہائی غیر مدبرانہ طور پر نہر سوئز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا اور اس کے نتیجہ میں مصر اور خود نہر سوئز دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

شاہ فاروق مصر کے آخری بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنے زوال کے وقت کہا تھا کہ دنیا میں بالآخر پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کا اور ایک برطانیہ کا۔ شاہ فاروق کی یہ بات لفظ بلفظ درست ثابت ہوئی۔ آج فی الواقع یہی پانچ بادشاہ دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ چار تاش کے، کیونکہ تاش کے بادشاہ کو اپنی بادشاہت باقی رکھنے کے لئے کسی ملک کی ضرورت نہیں۔ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بھی اپنی بادشاہت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور جہاں تک برطانیہ کے بادشاہ کا تعلق ہے، اس کو برطانی قوم کی بڑھی ہوئی روایت پسندی نے قائم کر رکھا ہے۔

اس وقت ملکہ الزبتھ برطانیہ کی تاجدار ہیں۔ بادشاہ یا ملکہ کا لفظ بظاہر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ بننا اتنی زیادہ قیمت مانگتا ہے کہ اس کو جاننے کے بعد ایک حقیقت پسند آدمی کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے۔

بادشاہ اپنے ملک کا سب سے بڑا قیدی ہوتا ہے۔ لندن کے سفر کے زمانہ میں یہاں

کی ملکہ کے بارہ میں ایک دلچسپ مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا:

Mystery is the Secret the Royalty

(بادشاہت کا راز اس کا پراسرار ہونا ہے) اگر لوگ یہ جان لیں کہ بادشاہ بھی انہیں جیسا ایک انسان ہے تو بادشاہت کی جڑیں اکھڑ جائیں۔" کو اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ کوئی دکھائی دے تو اس کو سب سے دور کی شاخ پر بیٹھنا چاہئے۔ اور اسی کے ساتھ اپنے منھ کو بند رکھنا چاہئے"، لوگوں کے اوپر بادشاہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ بادشاہ کو اپنے سے زیادہ عقل مند اور بڑا سمجھیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ بادشاہ مسلسل لوگوں سے دور رہے اور کم سے کم بولے۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کبھی عوام کے درمیان ہنسی نہیں:

She never smiled in public

برطانیہ کا بادشاہ برطانی لوگوں کی روایت پرستی کی بنا پر ابھی تک بادشاہ بنا ہوا ہے۔ مگر زمانہ کی تبدیلی نے موجودہ زمانہ کے بادشاہ کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں جن کا حل بظاہر آسان نہیں۔

موجودہ زمانہ آزادی خیال کا زمانہ ہے۔ جابرانہ حکومتیں بھی موجودہ زمانہ میں یہ نہیں کر پاتیں کہ وہ پریس کی آزادی پر پابندی لگا دیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ مشہور ہے۔ فرانس کے جنرل ڈیگال جب اپنے ملک میں برسر اقتدار آئے تو ابتداءً اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے کافی جبر سے کام لیا۔ لوگوں پر مظالم بھی کئے گئے۔ مگر اسی زمانہ میں مشہور فلسفی سارتر آزاد تھا اور حکومت کی پالیسیوں پر کھلی تنقیدیں کرتا تھا۔ کسی نے جنرل ڈیگال سے کہا کہ آپ کی حکومت نے سارترے کے مخالف قلم کو آزاد کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ ڈیگال نے جواب دیا:

سارترے جیسے لوگ حکومتوں کا ضمیر ہوتے ہیں اور ضمیر کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

برطانی پریس نے آجکل شاہی خاندان کے اندرونی حالات چھاپنے شروع کر دئے ہیں۔ لندن کے اخبار سن (Sun) نے شہزادی ڈائنا کے بارہ میں لکھا کہ محل کے باورچی خانہ میں وہ ننگے پاؤں تھیں اور ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھیں۔ اس طرح کے انکشافات شاہی خاندان کی عظمت (Majesty) کو مجروح کرتے ہیں۔ چنانچہ ملکہ الزبتھ نے لندن کی عدالت میں مذکورہ اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ اس کو محل کی اندرونی باتوں کو چھاپنے سے روکا جائے۔

اسی طرح ۱۹۸۲ میں جب مسٹر فاگن (Michael Fagan) محل میں داخل ہوا اور ملکہ کی

خواب گاہ تک پہنچ گیا جہاں وہ اکیلی تھیں تو لوگوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ فلپ صاحب کہاں تھے :

Where was Philip

اس کے بعد اخباروں نے انکشاف کیا کہ چونکہ مسٹر فلپ (ملکہ کے شوہر) سوتے وقت خراٹا لیتے تھیں اس لئے ان کو ملکہ کے کمرہ میں سونے کی اجازت نہیں۔ وہ رات کے وقت دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ کالم نگار اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے :

It must be a hard life for the royal family these days trying to keep sane, trying to be both human and royal at the same time. The more they try to maintain that dignity in public, the more hysterical they are likely to get in private. And with cooks ready to tell all to the press, they have no place to laugh or cry. It is a dilemma of our times.

شاہی خاندان کے لئے یقیناً یہ بڑی سخت زندگی ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے آپ کو اعتدال پر قائم رکھیں۔ ایک ہی وقت میں وہ عام آدمی بھی ہوں اور بادشاہ بھی۔ عوام میں وہ جتنا زیادہ اپنی شاہی عظمت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں گے اتنا ہی زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں جذباتی بن جائیں۔ ایسے باورچیوں کے ساتھ جو پریس کو ہر بات بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کے لئے نہ ہنسنے کا موقع باقی رہا ہے اور نہ چیخنے کا۔ یہ ہمارے وقت کی ایک دوطرفہ مشکل ہے۔

ایک ملکہ یا شہزادہ باہر سے دیکھنے میں لوگوں کو پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کو اندر سے دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف ہوگی۔

ہفتہ وار ٹائم (نیویارک) میں خطوط کے کالم میں شاہی تعاقب (Royal Hunt) کے عنوان کے تحت ایک خاتون لکھتی ہیں :

When I was little, I dreamed of marrying a prince. After reading about how the press pursues the princess of Wales I realize how nice it is that my prince is a pharmacist.

جب میں چھوٹی تھی تو میں کسی شہزادہ سے شادی کرنے کا خواب دیکھتی تھی۔ اب یہ پڑھنے کے بعد کہ پریس کس طرح شہزادی ویلز کا پیچھا کرتا ہے، میری سمجھ میں آیا کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ میرا "شہزادہ" ایک دوا ساز ہے۔

شاہی ادارہ کو باقی رکھ کر برطانی لوگ زبردست فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاہ اور ملکہ کا

لفظ برطانیہ میں سیکڑوں سال کی قابل احترام تاریخ رکھتا ہے۔ اس طرح شاہ اور ملکہ برطانی عوام کے لئے اتحاد اور اتفاق کا مرکزی نقطہ (فوکس) فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ فائدہ ہے جو اندرونی اتحاد کی صورت میں برطانیہ کو شاہی ادارہ سے حاصل ہوتا ہے۔

آسٹریلیا میں یہ ذہن ابھرا کہ آسٹریلیا کامل طور پر برطانیہ سے موجودہ دستوری رشتہ کو ختم کرلے۔ برطانیہ نے یہ کیا کہ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا کو وہاں بھیج دیا۔ میں جن دنوں لندن میں تھا، دونوں شاہی افراد آسٹریلیا کے دورہ پر تھے۔ ٹائمس (۲۹ مارچ ۱۹۸۳) نے رپورٹ شائع کی تھی کہ شاہی جوڑا جب سڈنی پہنچا تو عوام بیتاب ہوکر سڑکوں پر نکل پڑے۔ عوامی سمندر میں ایک شخص نے پلے کارڈ بلند کیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ شاہ واپس جاؤ (Go Home Royals) ایک معمر خاتون لپک کر آئیں اور پلے کارڈ چھین کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ عظمت اور تقدس کی طویل روایت کے ساتھ آسٹریلیا کے شاہی دورہ نے وہاں کے معاملہ کو ٹھنڈا کر دیا۔

برطانیہ نے اگرچہ اپنا سیاسی امپائر کھو دیا ہے۔ مگر اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی عالمی تصویر کو محفوظ رکھا ہے۔ پاکستان ایرویز کے بعد برٹش ایرویز غالباً واحد ہوائی کمپنی ہے جس کے جہازوں میں چھ زبانوں کے ساتھ اردو زبان میں بھی ہدایات لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح انگریز اپنی عالمی تصویر کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ان کو زبردست سیاسی اور تجارتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

جو ممالک اب بھی "برطانی کامن ویلتھ" کے نام سے برطانیہ کی چھتری میں موجود ہیں۔ ان کو اپنے ساتھ باندھے رکھنے کے لئے بھی بادشاہت کا ادارہ بہت موثر ہے، جب بھی کسی ملک میں ناراضگی کی لہر اٹھتی ہے تو انگریز اپنے بادشاہ یا ملکہ کو وہاں بھیج دیتے ہیں۔ جو وہاں جاکر کیمرہ کے سامنے مسکراتا ہے اور ہاتھ ہلاکر لوگوں کو مبارک باد دیتا ہے۔ اس کے بعد تمام مسئلے اپنے آپ ختم ہوجاتے ہیں۔

اس طرح برطانیہ نے اپنے پچھلے مقبوضات میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اقتصادی مفادات محفوظ کر رکھے ہیں۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں میں نے اپنی گھڑی میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب لندن میں چھ بجے کا وقت ہوتا تو میری گھڑی میں بارہ بج رہے ہوتے۔ ایک مرتبہ جب میں نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی تو ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں لندن والوں کے مقابلہ میں چھ گھنٹے

آسگے ہوں ۔ مگر بہت جلد میری غلط فہمی دور ہوگئی جب مجھے یاد آیا کہ میرا آگے ہونا صرف اس بنا پر ہے کہ میں لندن میں بیٹھ کر دہلی کی گھڑی اپنے ہاتھ پر باندھے ہوئے ہوں ۔

اس طرح کی خوش فہمی اس وقت بڑی خطرناک ہوتی ہے جب کہ وہ فکری اور اعتقادی روپ اختیار کرکے آدمی کے ذہن میں داخل ہوجائے ۔ ایسا آدمی اپنے جھوٹے تخیلات کی بنا پر بڑے بڑے اقدامات کر گزرتا ہے ۔ اور جب قانون قدرت کے مطابق وہ ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لئے مزید غلطی یہ کرتا ہے کہ دوسروں کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے کران کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان جاری کر دیتا ہے ۔ پہلے اگر اس نے فرضی اقدام کی نادانی کی تھی تو اب وہ فرضی شکایت کی نادانی میں مبتلا ہوجاتا ہے ۔ اس طرح وہ اپنے وقت اور اپنے مسائل کو برباد کرتا رہتا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر قبر میں چلا جاتا ہے تاکہ وہاں تقدیر کے پردہ پر اپنی حقیقی تصویر کو دیکھے ، صرف اس قیمت پر کہ دوبارہ اس کے لئے لوٹنے یا تلافی کرنے کا موقع نہ ہو ۔

واپسی کے وقت ایک عجیب لطیفہ پیش آیا ۔ روم سے میں ایر انڈیا پر سفر کر رہا تھا ۔ ایر انڈیا میں انگریزی کے ساتھ ہندی میں اعلان ہوتا ہے ۔ اناؤنسر نے اعلان کرتے ہوئے کچھ الفاظ کہے تو مجھے سنائی دیا :

" بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے "

یہ سن کر میں سمجھا کہ شاید کوئی بات گڑبڑ ہوگئی ہے اور ہوائی جہاز میں آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے ۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا ۔ مگر دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ میں نے پورا اعلان نہیں سنا ۔ پورا اعلان یہ تھا :

ٹائلٹ میں سموکنگ نہ کریں ۔ اس سے بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے ۔

ہمارے سماج میں پچاس فی صد سے زیادہ باتیں اسی قسم کی ادھوری معلومات کی بنا پر ہوتی ہیں ۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کی ضرورت محسوس کرتے ہوں ۔

انجمن خدام القرآن (لاہور) ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جو ہر سال محاضرات قرآنی (قرآنی سیمنار) کے نام سے لاہور میں اجتماع کرتا ہے ، اس میں ملک اور بیرون ملک کے علماء اور دانشور قرآن کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کرتے ہیں ۔

سال رواں میں انجمن خدام القرآن کا یہ اجتماع یکم اپریل تا ۵ اپریل ۱۹۸۳ منعقد ہوا ۔

اس اجتماع میں شرکت کے لئے میرے نام دعوت نامہ آیا تھا۔ انجمن نے اپنے اعلانات میں میرا نام بھی شائع کردیا تھا۔ مگر افسوس کہ میں اس اجتماع میں شریک نہ ہوسکا۔ میں نے ۲ مارچ ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں درخواست دی تھی مگر پاکستان کی "اسلامی حکومت" نے مجھے ویزا نہیں دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مارچ کے پہلے عشرہ میں ہندستان میں ناوابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی کانفرنس تھی۔ اس سلسلے میں پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق صاحب نئی دہلی آئے ہوئے تھے۔ نئی دہلی کے دوران قیام انہوں نے ایک روز پاکستانی سفارت خانہ کا معائنہ کیا۔ وہاں ہندستانی لوگوں نے بتایا کہ ان کو پاکستان کے سفر کے لئے ویزا حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ جناب ضیاء الحق صاحب نے حکم دیا کہ آج کی تاریخ تک جتنی درخواستیں آچکی ہیں ان سب کو ویزا جاری کردیا جائے۔ چنانچہ پاکستانی سفارت خانہ نے اس دن ۲۴ گھنٹہ کام کرکے تقریباً دو ہزار درخواستوں کا ویزا جاری کردیا۔

امید تھی کہ اس مجموعی فیاضی میں ہم کو بھی حصہ ملا ہوگا۔ کیونکہ انہیں تاریخوں میں ہماری درخواست بھی پاکستانی سفارت خانہ میں موجود تھی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ۲۲ مارچ کو ہمارا آدمی پاکستانی سفارت خانہ گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ ویزا جاری کرنے کے بارہ میں صدر پاکستان کا جو حکم تھا وہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے پاکستان جارہے ہوں۔ آپ چونکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہیں اس لئے آپ کے ویزہ کے لئے اسلام آباد سے منظوری ملنا ضروری ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ میں اگلے دن لندن کے لئے روانہ ہورہا ہوں۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں معلوم کرلیں۔ اسلام آباد سے اجازت نامہ آتے ہی ہم لندن کے پاکستانی سفارت خانہ کو ٹیلیکس کردیں گے۔

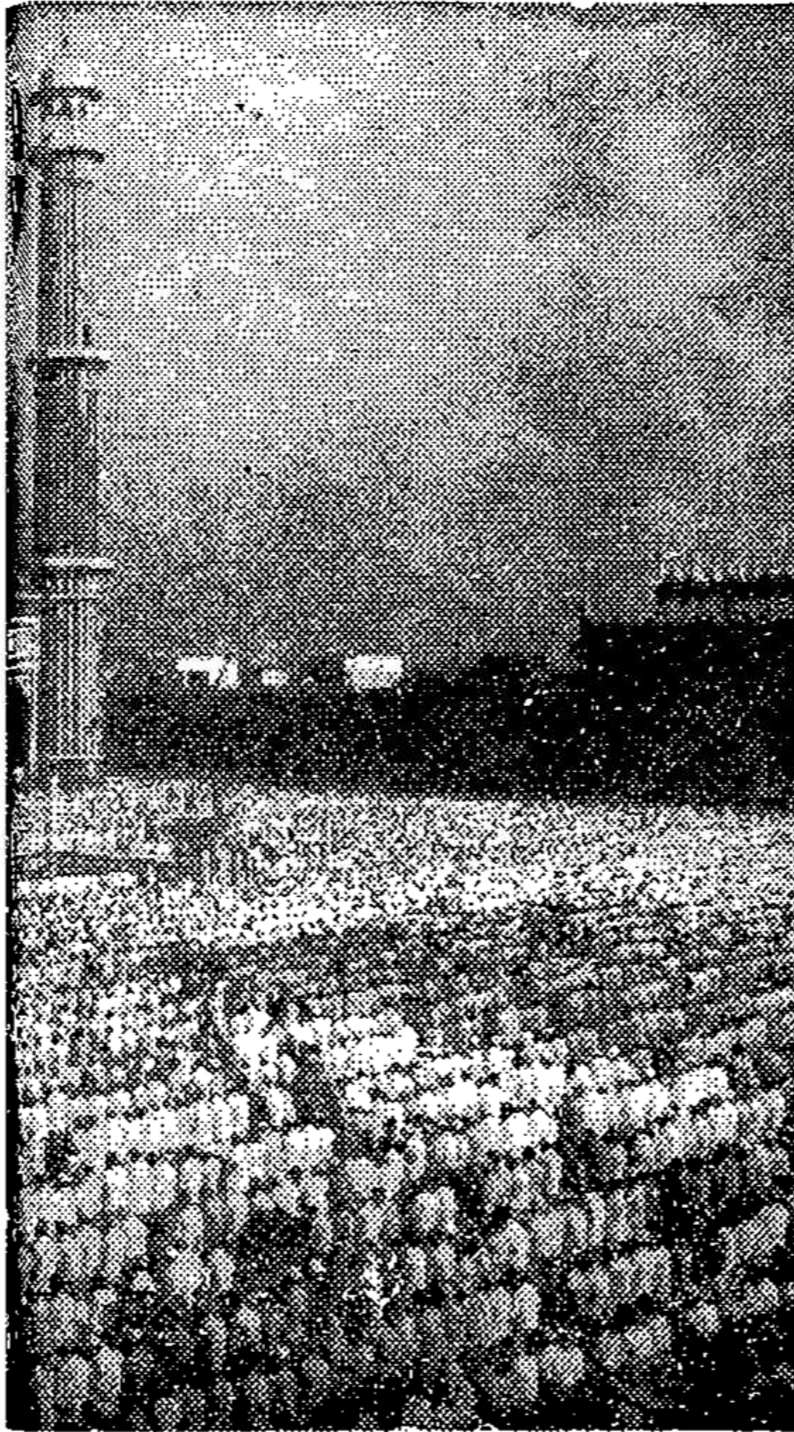
لندن میں میرے قیام کے آخری دن ۲۸ مارچ کو لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں ٹیلیفون کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ہم کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ویزا نہ ملنے کی وجہ سے میں لاہور کے قرآنی سیمینار میں شریک نہ ہوسکا۔

کیسی عجیب ہوگی وہ اسلامی حکومت جس کو نہ صرف غیر اسلامی پارٹیوں سے خطرہ ہو بلکہ خود اسلام سے بھی خطرہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں کو اسلام سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا ان مسلم حکومتوں کو ہے جنہوں نے اپنے دعوے کے مطابق اپنے یہاں مکمل اسلام قائم کر رکھا ہے۔

INDIA

12 PAGES **76 PAISE**

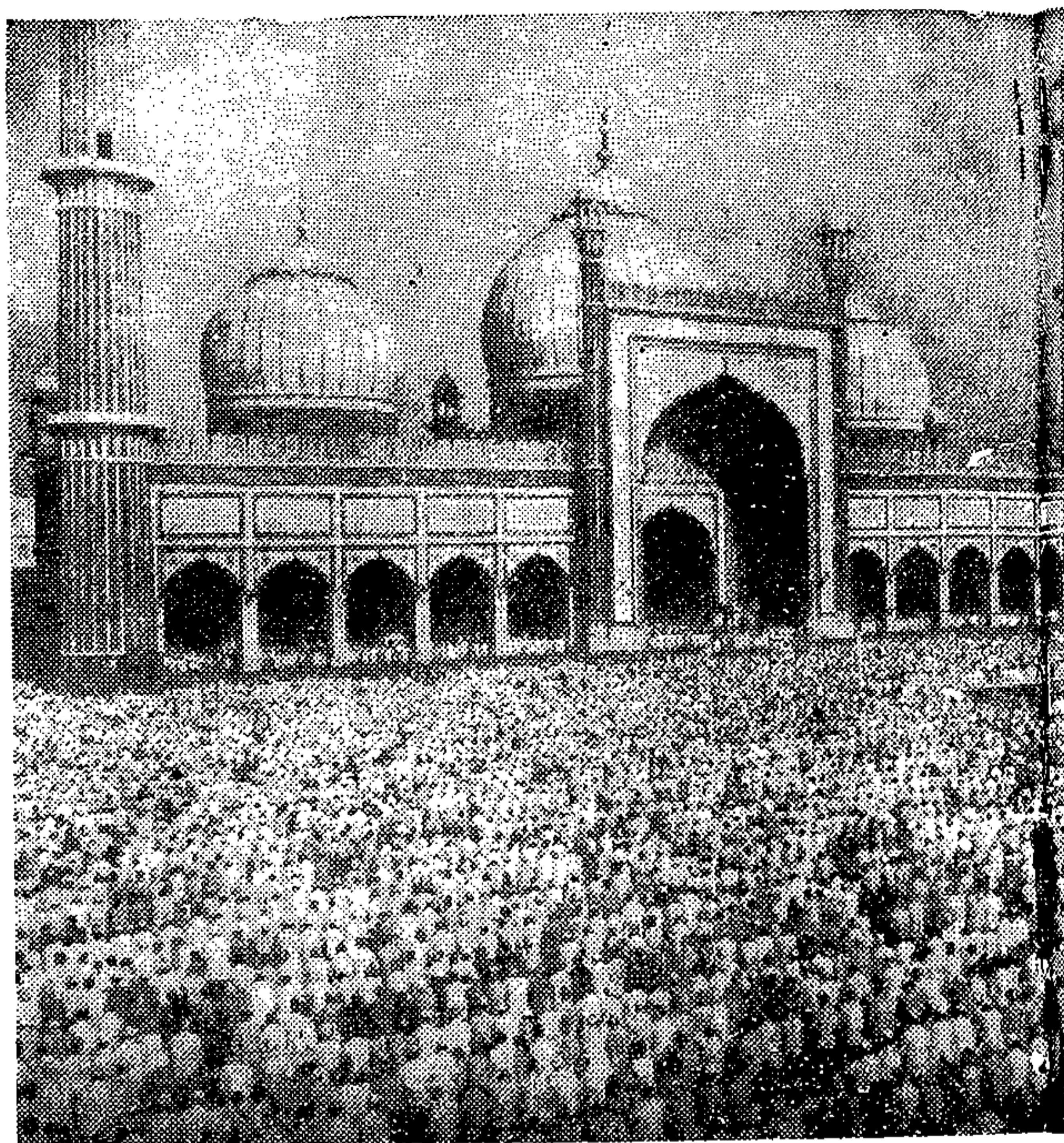
ہندستانی مسلمان



l photo.

اس تصویر میں دہلی کے مسلمان عیدالفطر (۱۲ جولائی ۱۹۸۳) کی اجتماعی نماز ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کتنا مقدس اور شاندار ہے یہ منظر۔ ہر سال عید کے موقع پر اس قسم کی تصویریں دارالسلطنت کے بڑے بڑے اخبارات میں صفحۂ اوّل پر نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ یہ تصویریں گویا مسلمانوں کے عزّت ووقار کی علامت ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں نے اگرچہ اپنی نادانی سے بہت کچھ کھودیا ہے مگر انھوں نے سب کچھ نہیں کھویا ہے۔ اگر وہ "ناممکن" سے اپنا سر نہ ٹکرائیں بلکہ "ممکن" سے اپنی کوششوں کا آغاز کریں تو ان کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ یہاں ان کے لئے آج بھی وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہتے ہیں، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔

TIMES OF I
CITY NEW DELHI: WEDNESDAY, JULY 13, 1983



Eid prayers at Jama Masjid in Delhi on Tuesday.—TOI

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے ۔ ایسے لوگ اپنے رب کے سامنے پیش ہوں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا ۔ سنو، اللہ کی لعنت ہے ظالموں کے اوپر ۔ ان لوگوں کے اوپر جو اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں ، یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں ۔ وہ لوگ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے ، ان پر دہرا عذاب ہوگا ۔ وہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا ۔ اور وہ سب کچھ ان سے کھویا گیا جو انہوں نے گھڑ رکھا تھا ۔ اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے ۔ ۱۸ ــ ۲۲

"خدا پر جھوٹ گھڑنے" سے مراد خدا کی ذات پر جھوٹ گھڑنا نہیں ہے ۔ اس سے مراد خدا کی بات پر جھوٹ گھڑنا ہے ۔ خدا اپنا پیغام سنانے کے لئے خود سامنے نہیں آتا بلکہ ایک انسان کی زبان سے اس کا اعلان کراتا ہے ۔ یہ انسان اس وقت بظاہر ایک معمولی انسان ہوتا ہے ، مگر اس کے کلام میں خدا کی واضح جھلکیاں ہوتی ہیں ۔ اگر لوگ اس کو اس کے کلام کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ اس کی عظمتوں میں خدا کو پالیں ۔ مگر لوگوں کی سطحیت اور ظاہر پرستی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہیں سنانے والے کی معمولی حیثیت میں اٹک کر رہ جاتی ہیں ۔ پیغام بر کا معمولی ہونا انہیں نظر آتا ہے مگر پیغام کا غیر معمولی ہونا انہیں دکھائی نہیں دیتا ۔ چنانچہ وہ اس کو ایک عام انسان کا معاملہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ اس کی بات میں جھوٹے اعتراضات نکالتے ہیں ۔ اور اس کو اس طرح نظر انداز کردیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ۔

اس ظالمانہ رویہ کی اصل وجہ بے خوفی کی نفسیات ہے ۔ لوگوں کو آخرت پر یقین نہیں ۔ ان کے دلوں میں خدائے قہار و جبار کا خوف نہیں ۔ اس لئے وہ اس پیغام کے بارہ میں سنجیدہ نہیں ہوپاتے ۔ اور جس معاملہ میں آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ اس کے متعلق صحیح ردعمل پیش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے گا ۔

مگر لوگوں کی یہ غیر سنجیدگی اس وقت رخصت ہوجائے گی جب وہ قیامت میں مالک کائنات کے سامنے کھڑے ہوں گے ۔ اس وقت ان کی موجودہ آزادی ان سے چھن چکی ہوگی ۔ جن اسباب و وسائل کے بھروسہ پر وہ سرکش بنے ہوئے تھے وہ خدا کا ٹیپ ریکارڈر بن کر ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گے ۔ اس وقت عیاناً یہ کھل جائے گا کہ خدا کے داعی کو جو انہوں نے جھٹلایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو سمجھنے سے عاجز تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے بارہ میں سنجیدہ نہ تھے ۔ قیامت کی ہولناکی اچانک انہیں سنجیدہ بنا دے گی ۔ اس وقت اپنی بے بسی کے ماحول میں وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ

لیں گے جس کو دنیا میں اپنی آزادی کے ماحول میں سمجھ نہیں پاتے تھے۔

اللہ نے انسان کو ایسی اعلیٰ صلاحیتیں دی ہیں کہ اگر وہ ان کو استعمال کرے تو وہ ہر بات کو اس کی گہرائی تک سمجھ سکتا ہے۔ اور اپنے دنیوی معاملات میں واقعۃً وہ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ کان رکھتے ہوئے بہرا بن جاتا ہے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔

آدمی کی کامیابی اس کی سنجیدگی (Sincerity) کی قیمت ہے۔ جو لوگ دنیا کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ دنیا میں کامیاب رہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ ہوں وہ آخرت میں کامیاب رہیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ کیا یہ دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ کیا تم غور نہیں کرتے ۲۴—۲۳

اخبات کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں ھو خبیت القلب (وہ شکستہ دل ہے) یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائگی۔ ایمان ایک دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع و بصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کرکے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے تین پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کے عین فطری نتیجے کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدائی عمل میں

ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائیگا۔

دنیا میں اعلیٰ ترین امتحانی حالات پیدا کرکے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اپنے آپ کو کیا ثابت کرتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر (شعور) کو صحیح طور پر استعمال کرکے حقیقت واقعہ کو جانا اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔ یہ دیکھنے اور سننے والے لوگ ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنے سمع وبصر کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس کو نہ حقیقت واقعہ کی معرفت حاصل ہوئی اور نہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال سکا۔ یہ اندھے اور بہرے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں بالکل مختلف قسم کے انسان ہیں۔ اور دو مختلف انسانوں کا انجام ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تم کو کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے سردار ول نے کہا، جنہوں نے انکار کیا تھا کہ ہم تو تم کو بس اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی تمہارا تابع ہوا ہو سوائے ان کے جو ہم میں پست لوگ ہیں، بے سمجھے بوجھے۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تم کو ہمارے اوپر کچھ بڑائی حاصل ہو، بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا خیال کرتے ہیں　۲۷ — ۲۵

خدا کے جتنے پیغمبر آئے، اسی لئے آئے کہ وہ انسان کو خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ کریں۔ یہ منصوبہ کہ انسان موجودہ دنیا میں بغرض امتحان رکھا گیا ہے۔ یہاں اگرچہ بظاہر مختلف چیزوں کی عبادت کے مواقع ہیں۔ مگر اصل مطلوب صرف یہ ہے کہ انسان خدا کا عابد بنے۔ جو لوگ خدا کے عابد نہ بنیں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ ایسے لوگوں کے لئے مرنے کے بعد کی زندگی میں سخت عذاب ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہی بات کہی۔ وہ اس کے لئے نذیر مبین بن گئے۔ مگر

آپ کی قوم نے آپ کی بات نہیں مانی۔

اس کی وجہ لوگوں کی ظاہر پرستی تھی۔ انسان کی گمراہی کی نظریاتی طور پر بہت سی قسمیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر دور کے انسانوں کی گمراہی صرف ایک رہی ہے۔ اور وہ ہے ظاہر پرستی یا دنیا پسندی۔ دنیا پرست لوگ، عین اپنے مزاج کے مطابق، دنیوی چیزوں کو حق اور ناحق کا معیار سمجھتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس کے پاس ظاہری رونقیں ہوں وہ حق پر ہے اور جو دنیا کی رونقوں سے محروم ہو وہ ناحق پر۔

خدا کا داعی جب اٹھتا ہے تو اپنے ہم عصروں کو وہ صرف انسانوں میں سے ایک انسان نظر آتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے اس کے گرد و پیش بڑائی کا کوئی خصوصی نشان نہیں ہوتا۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دین کا علم بردار ہوتا ہے اس کے ساتھ چونکہ ابھی تک دنیوی فائدے وابستہ نہیں ہوتے، اس لئے اس کی طرف بڑھنے والے زیادہ وہ تہی دست لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایک "نئے دین" کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کچھ کھونا نہ پڑے۔ یہ صورت حال خاص طور پر، وقت کے بڑوں کے لئے، فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب دنیا ان کے ساتھ نہیں ہے تو حق بھی ان کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ حتی کہ قوم میں ایسے لوگ بھی نکلتے ہیں جو ان کو جھوٹا اور دھوکا باز کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

نوح نے کہا اے میری قوم، بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا سکتے ہیں جب کہ تم

اس سے بیزار ہو۔ اور اے میری قوم، میں اس پر تم سے کچھ مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور میں ہرگز ان کو اپنے سے دور کرنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے رب سے ملنا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں تم لوگ جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میری قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابلہ میں کون میری مدد کرے گا۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی خبر رکھتا ہوں۔ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جو لوگ تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں ان کو اللہ کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ہی ظالم ہوں گا　　۲۸ — ۳۱

یہاں "بینہ" سے مراد دلیل ہے اور رحمت سے مراد نبوت ہے (تفسیر النسفی) اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر جب کسی قوم کو دعوت دیتا ہے تو وہ دو چیزوں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ دلیل اور نبوت۔ پیغمبر کے بعد کوئی داعی بھی اسی وقت داعی ہے جب کہ وہ انہیں دو چیزوں پر کھڑا ہو۔ اس فرق کے ساتھ کہ دلیل کے بعد دوسری چیز جو اس کے پاس ہوگی وہ بالواسطہ طور پر پیغمبر سے ملی ہوئی ہوگی۔ جب کہ پیغمبر کے پاس وہ براہ راست خدا کی طرف سے آئی ہے۔

قوم جس وقت خدا کے داعی کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے کہ اس کے یہاں ظاہری اعتبار سے کوئی قابل لحاظ چیز نہیں، عین اسی وقت اس کے پاس ایک بہت بڑی قابل لحاظ چیز موجود ہوتی ہے۔ اور وہ دلیل اور ہدایت ہے۔ دلیل اور ہدایت کی بڑائی کامل طور پر خدا کے داعی کے پاس موجود ہوتی ہے۔ مگر یہ بہرحال معنوی بڑائی ہے۔ اور جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر میں اٹکی ہوئی ہوں ان کو معنوی بڑائی کیوں کر دکھائی دے گی۔

دعوت الی اللہ کا کام خالص اخروی کام ہے۔ اس کی صحیح کارکردگی کے لئے ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان زر اور زمین کے جھگڑے نہ ہوں۔ یہ ذمہ داری خود داعی کو لینی پڑتی ہے کہ اس کے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو۔ اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کے مادی اور معاشی جھگڑے یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔ جس داعی کا یہ حال ہو کہ وہ ایک طرف دعوت دے اور دوسری طرف مدعو سے دنیوی چیزوں کے لئے احتجاج اور مطالبہ بھی کر رہا ہو، وہ داعی نہیں، مسخرہ ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہ مدعو کی نظر میں ہو سکتی ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

مدعو کا امتحان یہ ہے کہ وہ بظاہر ایک بے عظمت انسان کے اندر حق کی عظمت کو دیکھ لے۔ — اسی طرح داعی کا امتحان یہ ہے کہ وہ کسی بے دین کا اس لئے استقبال نہ کرنے لگے کہ وہ مال وجاہ کا مالک ہے۔ اور کسی دین دار کو اس لئے ناقابل لحاظ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس دنیوی شان وشوکت

کی چیزیں موجود نہیں۔ داعی اگر ایسا کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ زبان سے آخرت کی اہمیت کا وعظ کہہ رہا ہے اور عمل سے دنیا کی اہمیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنی تردید آپ ہے۔ اور جو شخص اپنی تردید آپ کرے اس کی بات کی دوسروں کی نظر میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

انہوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کر لیا۔ اب وہ چیز لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے رہے ہو، اگر تم سچے ہو۔ نوح نے کہا اس کو تو تمہارے اوپر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ جا سکو گے۔ اور میری نصیحت تم کو فائدہ نہیں دے گی اگر میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں جب کہ اللہ یہ چاہتا ہو کہ وہ تم کو گمراہ کرے۔ وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے ۳۲ — ۳۴

حضرت نوح نے اپنی قوم سے جدال (جھگڑا، در مناظرہ) نہیں کیا تھا۔ وہ سنجیدہ انداز میں اپنا صالح پیغام ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مگر آپ کی سنجیدہ دعوت آپ کی قوم کو الٹی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب اس کی اپنی ذات زد میں آ رہی ہو تو وہ سنجیدگی کھو دیتا ہے۔ ایسی بات کو وہ دلیل اور ثبوت کے اعتبار سے نہیں دیکھتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کو رد کر دیتا ہے۔ داعی حق کی ٹھوس دلیل بھی اس کو بحث و جدال معلوم ہونے لگتی ہے۔

"بہت جدال کر چکے" کا جملہ در اصل یہ بتانے کے لئے نہیں ہے کہ نوح نے کیا کہا تھا۔ بلکہ وہ اس کو بتاتا ہے کہ سننے والوں نے آپ کی بات کو کیا درجہ دیا تھا۔

اسی طرح مخالفین نوح کا عذاب کو طلب کرنا حقیقۃً عذاب کو طلب کرنا نہیں تھا۔ بلکہ حضرت نوح کا مذاق اڑانا تھا کہ دیکھو یہ شخص ایسی بات کہہ رہا ہے جو کبھی ہونے والی نہیں۔ وہ اپنی پوزیشن کو اتنا مستحکم سمجھتے تھے جس میں ان کے خیال کے مطابق کہیں سے عذاب آنے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی ذہن کے تحت انہوں نے کہا کہ ہمارے انکار کی سزائیں جس عذاب کی تم خبر دیتے رہے

ہو وہ عذاب لاؤ۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ایسا عذاب کبھی آنے والا نہ تھا اس لیے معناً اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم حق پر ہیں اور تم ناحق پر۔

حضرت نوح نے جواب دیا کہ تم معاملہ کو میری نسبت سے دیکھ رہے ہو اور چونکہ میں کمزور ہوں اس لئے تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عذاب کبھی تمہارے اوپر آسکتا ہے۔ اگر معاملہ کو خدا کی نسبت سے دیکھتے تو تم یہ نہ کہتے۔ کیونکہ پھر تمہیں نظر آجاتا کہ اس دنیا میں ظالموں کے لئے عذاب کا آنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا نکلنا اور زلزلہ کا پھٹنا۔

داعیٔ حق کی بات کو ماننے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ سننے والا اس کو کہنے والے کے اعتبار سے نہ دیکھے بلکہ جو کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے دیکھے۔ چونکہ حضرت نوح کی قوم آپ کی بات کو بس ایک عام انسان کی بات سمجھ رہی تھی، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اس ذہن کے تحت تم میری بات کی قدر وقیمت کبھی نہیں پا سکتے۔ اب تو تمہارے لئے اسی دن کا انتظار کرنا ہے جب کہ خدا براہ راست تمہارے سامنے آجائے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

ع ٣

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرا جرم میرے اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو اس سے میں بری ہوں ٣٥

جو لوگ کہتے تھے کہ پیغمبر نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے، یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے، وہ وحی والہام کے منکر نہ تھے۔ حتیٰ کہ وہ ماضی کے رسولوں کو مانتے تھے۔ پھر انہوں نے ایسا کیوں کہا۔ یہ دراصل وحی کا انکار نہیں تھا۔ بلکہ صاحب وحی کا انکار تھا۔ جو شخص خدا کی طرف سے بول رہا تھا وہ دیکھنے میں ان کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتا تھا۔ ان کا ظاہر پرست مزاج سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ایسا ایک آدمی وہ شخص کیسے ہوسکتا ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام بری کے لئے چنا ہو۔

"میرا جرم میرے اوپر، تمہارا جرم تمہارے اوپر" یہ دراصل کلمۂ رخصت ہے۔ جب مخاطب دلیل سے بات کو نہیں مانتا۔ ہر قسم کی وضاحت کے باوجود وہ انکار پر تلا ہوا ہے تو داعی محسوس کرتا ہے کہ اس کے لئے اب آخری چارۂ کار صرف یہ ہے کہ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوجائے کہ میں اور تم دونوں حاکم اصلی کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔ وہاں ہر ایک کا حال کھل

جائے گا۔ اور ہر آدمی اپنی حقیقت کے اعتبار سے جیسا تھا اس کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا۔
جب دلیل کی حد ختم ہو جائے تو داعی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ یقین کی زبان میں کلام کرکے علٰحدگی اختیار کرلے۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۚ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَیَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَیْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ ؕ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۳۹﴾

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا سوا اس کے جو ایمان لا چکا۔ پس تم ان کاموں پر غمگین نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں۔ اور ہمارے روبرو اور ہمارے حکم سے تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے بات نہ کرو، بیشک یہ لوگ غرق ہوں گے۔ اور نوح کشتی بنانے لگا۔ اور جب اس کی قوم کا کوئی سردار اس پر گذرتا تو وہ اس کی ہنسی اڑاتا، انہوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو اس کو رسوا کردے اور اس پر وہ عذاب اترتا ہے جو دائمی ہے ۳۶ — ۳۹

انسان سے جو ایمان مطلوب ہے وہ ایمان وہ ہے جب کہ آدمی شعوری طور پر اپنے آزادانہ فیصلہ سے ایمان قبول کرے۔ پیغمبر کے طویل دعوتی عمل کے باوجود جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ ایسا کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ آزادانہ فیصلہ کے تحت خدا کے مومن بننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔
ایسے لوگوں کے لئے دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی آزادی چھین لی جائے اور ان کو لے جاکر براہ راست خدائے ذوالجلال کے سامنے کھڑا کر دیا جائے تاکہ جس چیز کا انہوں نے مومنانہ اقرار نہیں کیا تھا اس کا وہ مجرمانہ اقرار کریں اور اپنی سرکشی کی سزا بھگتیں۔
حضرت نوح کی سیکڑوں سال کی تبلیغ کے بعد ان کی قوم کے لئے یہ وقت آگیا تھا۔ اس

کے بعد حضرت نوح سے کہدیا گیا کہ اب تبلیغ کے کام سے فارغ ہو کر کشتی تیار کرو تاکہ جب سرکشوں کو غرق کرنے کے لئے خدا کا سیلاب آئے تو اس وقت تم اور تمہارے ساتھی اہل ایمان اس میں پناہ لے سکیں۔

حضرت نوح نے ایک بہت بڑی تین منزلہ کشتی تیار کی۔ اس کو بنانے میں کئی سال لگ گئے۔ جس زمانہ میں حضرت نوح اپنے چند ساتھیوں کو لیکر کشتی بنارہے تھے تو قوم کے سرکش لوگ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے۔ چونکہ وہ لوگ عذاب کی بات کو محض فرضی سمجھ رہے تھے اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ آنے والے مفروضہ عذاب سے بچنے کے لئے کشتی بھی تیار کی جارہی ہے تو وہ حضرت نوح کا اور بھی زیادہ مذاق اڑانے لگے۔

ایک آدمی سرکشی اور ناانصافی کے ذریعہ دولت سمیٹ رہا ہو تو ظاہر پرست آدمی اس کے گرد دنیا کا سازوسامان دیکھ کر اس کو کامیاب سمجھ لے گا۔ مگر جو شخص جانتا ہو کہ دنیا کا نظام اخلاقی قوانین پر چل رہا ہے، وہ مذکورہ شخص کی وقتی کامیابی میں مستقبل کی عظیم تباہی کا منظر دیکھ رہا ہوگا —— قوم نوح کے ظاہر پرست لوگ اگرچہ حضرت نوح کا مذاق اڑا رہے تھے، مگر حقیقتِ واقعہ کی نظر میں خود ان کا مذاق اڑ رہا تھا۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

قرء حفص بفتح الميم وامالة الراء

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور طوفان ابل پڑا ہم نے نوح سے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوا ان اشخاص کے جن کی بابت پہلے کہا جا چکا ہے اور سب ایمان والوں کو بھی۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اور نوح نے کہا کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا بھی۔ بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ اور کشتی پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان ان کو لیکر چلنے لگی۔ اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو اس سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے، ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔ اس نے کہا میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا کہ آج کوئی اللہ کے حکم سے بچانے والا نہیں مگر وہ جس پر اللہ رحم کرے۔ اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا۔ اور کہا گیا کہ اے زمین، اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا۔ اور پانی سکھا دیا گیا۔ اور معاملہ کا فیصلہ ہوگیا اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہو ظالموں کی قوم ۴۰ — ۴۴

جب کشتی بن کر تیار ہوگئی تو خدا کے حکم سے طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ زمین سے پانی کے دہانے پھوٹ پڑے۔ اوپر سے مسلسل بارش ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔ تمام لوگ اس میں ڈوب گئے۔ صرف وہ چند انسان اور کچھ مویشی بچے جو حضرت نوح کی کشتی میں سوار تھے۔ حتیٰ کہ حضرت نوح کا بیٹا بھی غرق ہوگیا —— خدا کی نظر میں کسی کی قیمت اس کے عمل کے اعتبار سے ہے نہ کہ رشتہ کے اعتبار سے، خواہ وہ رشتہ پیغمبر کا کیوں نہ ہو۔

جب تمام ڈوبنے والے ڈوب چکے تو خدا نے حکم دیا کہ طوفان تھم جائے۔ اور طوفان تھم گیا۔ پانی سمندروں اور دریاؤں میں چلا گیا اور زمین دوبارہ رہنے کے قابل ہوگئی۔

طوفان نوح کے موقع پر دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا کہ اونچے پہاڑ پر چڑھنے والے ڈوب گئے اور ہولناک موجوں کے باوجود کشتی میں بیٹھنے والے سلامت رہے۔ اس کی وجہ خود پہاڑ میں یا کشتی میں نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حکم خداوندی کا معاملہ تھا۔ حکم خداوندی اگر پہاڑ کے ساتھ ہوتا تو پہاڑ اپنے چڑھنے والوں کو بچاتا اور کشتی کا سہارا لینے والے ہلاک ہوجاتے۔ مگر اس موقع پر حکم خداوندی کشتی کے ساتھ تھا۔ اس لئے کشتی والے محفوظ رہے اور دوسری چیزوں کی پناہ لینے والے غرق ہوگئے۔

دنیا میں اسباب کا نظام محض ایک پردہ ہے۔ ورنہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے براہ راست خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری پردہ سے گزر کر اصل حقیقت کو دیکھ

لے۔ وہ اسباب کے اندر خدائی طاقتوں کو کام کرتا ہوا پالے۔

وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ﴿۴۷﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے رب، میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے، اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ خدا نے کہا اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں نہیں۔ اس کے کام خراب ہیں۔ پس مجھ سے اس چیز کے لئے سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ نوح نے کہا کہ اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے وہ چیز مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اور اگر تو مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ فرمائے تو میں برباد ہو جاؤں گا ۴۷ – ۴۵

طوفان نوح میں جو لوگ غرق ہوئے ان میں خود حضرت نوح کا بیٹا کنعان بھی تھا۔ حضرت نوح نے اس کو اپنی کشتی میں بٹھانا چاہا۔ مگر اس کے لئے ڈوبنا مقدر تھا اس لئے وہ نہیں بیٹھا۔ پھر انہوں نے اس کے بچاؤ کے لئے خدا سے دعا کی تو جواب ملا کہ یہ نادانی کا سوال ہے، ایسے سوالات نہ کرو۔

اصل یہ ہے کہ خدا کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوتا کہ جو لوگ بزرگوں کی اولاد ہیں۔ یا جو کسی حضرت کا دامن تھامے ہوئے ہیں ان سب کو نجات یافتہ قرار دے کر جنتوں میں داخل کر دیا جائے۔ خدا کے یہاں نجات کا فیصلہ خالص عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ نسبی یا گروہی بنیادوں پر۔

دنیا میں اگر نسبی رشتہ کا اعتبار ہے تو آخرت میں اخلاقی رشتہ کا اعتبار۔ طوفان نوح اسی لئے آیا تھا کہ انسانوں کے درمیان دوسری تمام تقسیمات کو توڑ کر اخلاقی تقسیم قائم کر دے۔ جو عمل صالح والے لوگ ہیں ان کو خدائی کشتی میں بٹھا کر بچا لیا جائے اور غیر عمل صالح والے تمام لوگوں کو طوفان کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہی واقعہ دوبارہ قیامت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ کامل طور پر ہوگا۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ ع ۴

کہا گیا کہ اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر اور ان گروہوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور (ان سے ظہور میں آنے والے) گروہ کہ ہم ان کو فائدہ دیں گے، پھر ان کو ہماری طرف سے ایک دردناک عذاب پکڑلے گا۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو بے شک آخری انجام ڈرنے والوں کے لئے ہے ۴۸ — ۴۹

جب تمام برے لوگ غرق ہو چکے تو طوفان تھم گیا۔ پانی دھیرے دھیرے زمین میں اور سمندروں میں چلا گیا۔ حضرت نوح کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی تھی، آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سے نکل کر زمین پر اترے۔ زمین دوبارہ خدا کے حکم سے سرسبز اور آباد ہو گئی۔

حضرت نوح جن لوگوں کے درمیان آئے وہ حضرت آدم کی نبوت کو ماننے والے لوگ تھے۔ آپ کے بعد آپ کی امت ابتداءً راہ راست پر رہی۔ اس کے بعد اس کی اگلی نسلوں میں بگاڑ آیا تو دوبارہ انبیاء بھیجے گئے۔ یہ بعد کو آنے والے انبیاء ان قوموں میں آئے جو حضرت نوح کی نبوت کو مانتی تھیں۔ اس کے باوجود جب انہوں نے وقت کے نبی کو مان کر اپنی اصلاح نہ کی تو وہ ہلاک کر دی گئیں۔ گویا صرف کسی نبی کو ماننا یا اس کی طرف اپنے کو منسوب کرنا نجات یافتہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان مطلوب ہے جو زندہ ایمان ہو اور جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ آدمی کی زندگی کو نیک عملی کی زندگی میں تبدیل کر دے۔

حضرت نوح کی تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ باطل پرستوں کا زور خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اور ان کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے۔ بالآخر ان کے لئے جو چیز مقدر ہے وہ ہلاکت ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں اہل ایمان خواہ کتنے ہی کم ہوں اور خواہ وہ بظاہر کتنے ہی بے زور ہوں۔ مگر جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوتا ہے تو یہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمتوں میں حصہ دار بنائے جاتے ہیں، ابتداءً موجودہ دنیا میں اور آخری طور پر آخرت میں۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اِنْ اَنْتُمْ

إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ يٰقَوْمِ لَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے میری قوم، میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے۔ اور اے میری قوم، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تمہارے اوپر خوب بارشیں برسائے گا۔ اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ اور تم مجرم ہو کر روگردانی نہ کرو۔ ۵۰ — ۵۲

قوم عاد کی ہدایت کے لئے حضرت ہود کو اٹھایا گیا جو انہیں کے بھائی تھے۔ یہ پیغمبروں کے باب میں ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ قوم کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بخوبی طور پر قوم کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی زبان کو جانتے ہیں اور زیادہ موثر طور پر اس کے اندر دعوت حق کا کام کر سکتے ہیں۔

حضرت ہود نے اپنی قوم کو ایک اللہ کی عبادت کا پیغام دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تمہارا جو دین ہے وہ محض ایک جھوٹ ہے جو تم نے گھڑ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا طریقہ معروف معنوں میں صرف "مثبت طور پر" اپنی بات کہنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ وہ کھلی کھلی تنقید بھی کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک تنقید و تجزیہ کے ذریعہ ناحق کا ناحق ہونا واضح نہ کیا جائے اس وقت تک حق کا حق ہونا لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔

ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایسا ہوا کہ اس کے مخالفین اس کی پیغمبری کو ماننے کے لئے یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی بڑا عہدیدار ہو، اس کو دولت کے خزانے حاصل ہوں، وہ عالی شان عمارتوں میں رہتا ہو۔ مگر حق کے داعی کو جانچنے کا یہ معیار صحیح نہیں۔ داعی کی صداقت جانچنے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے مشن میں پوری طرح سنجیدہ ہو، اس کی بات آخری حد تک مدلل ہو۔ وہ ہر قسم کی دنیوی غرض سے بالاتر ہو۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عین حقیقتِ واقعہ ہو۔ اس کا پیغام کائناتی نظام سے کامل مطابقت رکھتا ہو۔ اس کو اختیار کرنا کامیابی کی شاہراہ پر چلنا ہو۔

تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا (بیفزاید شمارا قوتے باقوتے شما) کا مطلب مادی

قوت میں اضافہ نہیں ہے۔ کیونکہ قوم عاد اپنے زمانہ میں نہایت طاقتور تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر نے جب ان کو عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے کہا کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے (من اشد منا قوۃ، حم السجدہ ۱۵) اس لئے مادی قوت میں اضافہ کی بات، دعوتی اعتبار سے ان کے لئے زیادہ پرکشش نہیں ہو سکتی تھی۔

اس آیت میں قوت پر اضافہ کا مطلب ہے مادی قوت پر ایمانی قوت کا اضافہ۔ پیغمبر کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم ایمانی زندگی اختیار کر لو تو اس سے تم کو اخلاقی اور روحانی قوت حاصل ہوگی۔ موجودہ مادی زور کے ساتھ اخلاقی اور روحانی زور ملنے سے تمہاری طاقت گھٹے گی نہیں۔ بلکہ وہ مزید بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىکَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِہٖ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾

انہوں نے کہا کہ اے ھود، تم ہمارے پاس کوئی کھلی نشانی لے کر نہیں آئے ہو، اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ اور ہم ہرگز تم کو ماننے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ تمہارے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔ ھود نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بری ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو، اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھ کو مہلت نہ دو۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا جو میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۵۶ — ۵۳

قوم نے حضرت ھود سے کہا کہ تمہارے پاس اپنے برسر حق ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فی الواقع بھی حضرت ھود کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آنجناب کے پاس یقیناً دلیل تھی، مگر وہ مخاطبین کو دلیل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آدمی عام طور پر کسی

بات کو خالص دلیل کی بنیادوں پر جانچ نہیں پاتا ۔ بلکہ اس اعتبار سے دیکھتا ہے کہ جو شخص اس کو پیش کر رہا ہے وہ کیسا ہے ۔ چونکہ پیش کرنے والا اپنے زمانہ میں لوگوں کو ایک ناقابل لحاظ انسان دکھائی دیتا تھا اس لیے اس کی بات بھی لوگوں کو ناقابل لحاظ نظر آتی تھی ۔

جب ایک شخص وقت کے جمے ہوئے مذہب کو چھوڑ کر خالص بے آمیز دین کی دعوت لیکر اٹھتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ماحول میں وہ اجنبی بلکہ حقیر بن کر رہ جاتا ہے ۔ لوگ اس کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی ایسا شخص ہو جس کو خلل دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو ۔ حضرت ہود کے معاملہ میں یہی صورت حال تھی جس کی وجہ سے ان کی قوم کے لوگوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ ——— " ہمارا تو خیال ہے کہ تمہارے اوپر ہمارے بزرگوں کی مار پڑ گئی ہے " مگر داعیٔ حق کی صداقت کا ثبوت ، نظری دلائل کے بعد ، ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے مخالفین ہر قسم کی کوششوں کے باوجود اس کو زیر نہیں کر پاتے ۔

خدا کے پیغمبر جن قوموں میں آئے وہ سب خدا کو ماننے والی تھیں ۔ گویا داعی بھی خدا پرست ہونے کا مدعی تھا اور مدعو بھی خدا پرست ہونے کا مدعی ۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا دونوں میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے ۔ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ خدا صراط مستقیم (سیدھی شاہراہ) پر ہے ۔ اس لئے جو دین کے سیدھے خط پر چل رہا ہے وہ براہ راست خدا تک پہنچے گا اور جو ٹیڑھے راستوں پر چل رہا ہے اس کا راستہ ادھر ادھر بھٹک کر رہ جائے گا ۔ وہ خدا تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

حضرت ہود نے جب کہا کہ " میرا رب صراط مستقیم پر ہے " تو دوسرے لفظوں میں گویا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کی طرف بلا رہا ہوں وہ صراط مستقیم (دین کی شاہراہ) ہے ۔ اور تم لوگ جن چیزوں کو دین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہو وہ دین کی شاہراہ کے اطراف میں پگڈنڈیاں نکال کر ان کے اوپر دوڑنا ہے ۔ اس قسم کی دوڑ آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتی ، وہ اس کو ادھر ادھر بھٹکا کر چھوڑ دیتی ہے ۔

ان آیات کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضرت ہود کی بتائی ہوئی صراط مستقیم یہ نکلتی ہے ——— توحید ، عبادت الٰہی ، استغفار ، توبہ ، نعمتوں پر خدا کا شکر ، توکل علی اللہ ، خدا کو اپنا پروردگار ماننا ، صرف خدا کو تمام طاقتوں کا مالک سمجھنا ، خدا کو اپنے اوپر نگراں بنا لینا ۔ کبر کی روش کے بجائے اطاعت کی روش اختیار کرنا ۔

یہ سب دین کی بنیادی تعلیمات ہیں ۔ ان تعلیمات پر چلنا اور ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا گویا دین کی شاہراہ پر چلنا ہے ۔ اس پر چلنے والا سیدھے خدا تک پہنچتا ہے ۔ اس کے سوا جن چیزوں کو آدمی اہمیت دے اور ان کی دھوم مچائے وہ گویا اصل شاہراہ کے دائیں بائیں پگڈنڈیاں نکال

گران کے اوپر دوڑ رہا ہے ۔ ایسی دوڑ آدمی کو صرف خدا سے دور کرنے والی ہے ، وہ اس کو خدا
کے قریب نہیں پہنچا سکتی ۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا
تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا
هُودًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿٥٨﴾ وَتِلْكَ
عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿٥٩﴾
وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ
أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ﴿٦٠﴾

ع ۵ / ۱۱

اگر تم اعراض کرتے ہو تو میں نے تم کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کو دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا تھا ۔
اور میرا رب تمہاری جگہ تمہارے سوا کسی اور گروہ کو جانشیں (خلیفہ) بنائے گا ۔ تم اس کا کچھ نہ بگاڑ
سکو گے ۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے ۔ اور جب ہمارا حکم آپہنچا ، ہم نے اپنی رحمت
سے بچا دیا ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے ۔ اور ہم نے ان کو ایک سخت
عذاب سے بچا دیا ۔ اور یہ عاد تھے کہ انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا ۔ اور اس کے رسولوں
کو نہ مانا اور ہر سرکش اور مخالف کی بات کی اتباع کی ۔ اور ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اس دنیا
میں اور قیامت کے دن ۔ سن لو ، عاد نے اپنے رب کا انکار کیا ۔ سن لو ، دوری ہے عاد کے لیے جو
ہود کی قوم تھی ۵۷ — ۶۰

جو لوگ خدا کی بات کو نظر انداز کر دیں ، خدا بھی انہیں نظر انداز کر دیتا ہے ۔ یہ واقعہ جو موجودہ
دنیا میں جزئی طور پر پیش آتا ہے یہی قیامت میں کلی اور آخری طور پر پیش آئے گا ۔ اس وقت تمام
سرکش لوگ خدا کی رحمتوں سے دور کر دئے جائیں گے ۔ اور خدا کی رحمت صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی
جو دنیا کی زندگی میں خدا کے تابع اور وفادار بن کر رہے تھے ۔

اس دنیا میں خدا نے "استخلاف" کا اصول رائج کیا ہے ۔ یعنی ایک قوم کو ہٹانے کے بعد
دوسری قوم کو اس کی جگہ زمین پر متمکن کرنا ۔ دنیا میں یہ تمکن امتحان کی غرض سے وقتی طور پر ہوتا ہے ۔

آخرت میں خدا کی معیاری دنیا میں یہ تمکن انعام کے طور پر مستقل طور پر سچے اہل ایمان کو حاصل ہو گا۔

موجودہ امتحانی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں آدمی ہمیشہ خیر اور شر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کو آزادی ہوتی ہے کہ دونوں میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ مزید یہ کہ اکثر حالات میں اس دنیا میں شر کا غلبہ ہوتا ہے۔ خیر کی جانب صرف نشانیوں (نظری دلائل) کا زور ہوتا ہے۔ دوسری طرف شر کی جانب مادی طاقت موجود ہوتی ہے، وہ بھی اتنی بڑی مقدار میں کہ اس کے علم بردار سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر ماحول کے اندر ایسی دباؤ کی فضا پیدا کرتے ہیں کہ عام آدمی حق کی طرف بڑھنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا، اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تم کو زمین سے بنایا، اور اس میں تم کو آباد کیا۔ پس معافی چاہو، پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ بے شک میرا رب قریب ہے، قبول کرنے والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے صالح اس سے پہلے ہم کو تم سے امید تھی۔ کیا تم ہم کو ان کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اور جس چیز کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہہ ہے اور ہم بڑے خلجان میں ہیں۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت دی ہے تو مجھ کو خدا سے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ پس تم کچھ نہیں بڑھاؤ گے میرا سوائے نقصان کے ۶۱-۶۳

حضرت صالح نے اپنی قوم کو ایک خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ یہی ہر زمانہ میں تمام پیغمبروں کا مقصد تھا۔ مگر حضرت صالح کی قوم آپ کے پیغام کو قبول نہ کرسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اس کو براہ راست خدا سے جوڑنے کی بات کرتے تھے، جب کہ قوم کا حال یہ تھا کہ وہ خدا کے نام پر صرف اپنے اعاظم واکابر سے جڑی ہوئی تھی۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے کسی چیز کی اہمیت اور معنویت صرف اس وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ ان کے قومی بزرگوں کے قول وعمل میں اس کی تصدیق مل جائے۔ اب چونکہ حضرت صالح کے پاس صرف دلیل کا زور تھا، ان کی قوم ان کی بات کی اہمیت کو محسوس نہ کرسکی۔ حضرت صالح جس دین کی طرف بلا رہے تھے اس کی اہمیت خدا کی وحی اور زمین وآسمان کی نشانیوں میں غور کرنے سے واضح ہوتی تھی۔ جب کہ ان کی قوم صرف اس دین کی اہمیت سے باخبر تھی جو اکابر قوم کے ملفوظات اور معمولات سے ثابت ہوتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوم آپ کے دلائل کے مقابلہ میں لاجواب ہو کر بھی بس ایک قسم کے شبہہ کی حالت میں پڑی رہی۔

حضرت صالح، دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح، شخصیت اور ذہانت میں اپنی قوم کے ممتاز فرد تھے۔ لوگ امید رکھتے تھے کہ بڑے ہو کر وہ قوم کے ایک کارآمد فرد ثابت ہوں گے۔ مگر وہ بڑی عمر کو پہنچے تو انہوں نے قوم کے مروجہ مذہب پر تنقید شروع کردی۔ یہ دیکھ کر قوم کے لوگوں کو ان کے بارہ میں سخت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے کہا، ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تم ہمارے قائم شدہ مذہبی نظام کے ایک ستون بنو گے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے مذہبی نظام کو بے بنیاد ثابت کرنے پر اپنا سارا زور لگائے ہوئے ہو —— یہی معاملہ ہر دور میں خدا کے سچے داعیوں کو اپنی قوم کی طرف سے پیش آیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ

أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟ كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ۶۸

اور اے میری قوم، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی ہے۔ پس اس کو چھوڑ دو کہ وہ اللہ کی زمین میں کھائے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ بہت جلد تم کو عذاب پکڑ لے گا۔ پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ تب صالح نے کہا کہ تین دن اور اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو۔ یہ ایک وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا۔ پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بچالیا اور اس دن کی رسوائی سے (محفوظ رکھا)۔ بیشک تیرا رب ہی قوی اور زبردست ہے۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک ہولناک آواز نے پکڑ لیا پھر صبح کو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جیسے کہ وہ کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سنو، ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو، پھٹکار ہے ثمود کے لئے　۶۴ — ۶۸

حضرت صالح اپنی قوم سے کہتے تھے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم خدا کی پکڑ میں آجاؤ گے۔ ان کی قوم اگرچہ خدا اور رسالت کی منکر نہ تھی مگر اس نے حضرت صالح کی بات کو ایک مذاق سمجھا۔ کیونکہ حضرت صالح کے پاس اپنی پیغمبری کو ثابت کرنے کے لئے صرف نظری دلیل تھی اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف نظری دلیل کی بنیاد پر بہت کم اس کے لئے تیار ہوتا ہے کہ ایک مانوس چیز کو چھوڑے اور دوسری غیر مانوس چیز کو اختیار کرلے۔

حضرت صالح کی قوم جب نظری نشانیوں کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوئی تو آخری مرحلہ میں اس کے مطالبہ کے مطابق اس کے لئے حسی نشانی بھی ظاہر کردی گئی۔ یہ ایک اونٹنی تھی جو لوگوں کے سامنے ٹھوس چٹان کے اندر سے نکل آئی۔ ایسی نشانی کے بارہ میں خدا کا قانون ہے کہ جب وہ ظاہر کی جاتی ہے تو اس کے بعد لوگوں کے لئے امتحان کی مزید مہلت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حضرت صالح نے اعلان کردیا کہ اب تم لوگ یا تو توبہ کرکے میری بات مان لو، ورنہ تم سب لوگ ہلاک کر دئے جاؤ گے۔ مگر جو لوگ نظری دلائل کی قوت کو محسوس نہ کرسکیں وہ حسی دلائل کو دیکھ کر بھی اس سے عبرت پکڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد بھی حضرت صالح کی قوم اپنی سرکشی سے باز نہ آئی۔ حتی کہ اس نے خود اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے لئے مزید مہلت کا سوال نہ تھا۔ چنانچہ وہ مٹادی گئی۔

قوم صالح (ثمود) کا علاقہ شمال مغربی عرب (الحجر) تھا۔ حضرت صالح کو حکم ہوا کہ تم یہاں سے باہر چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنے مخلص ساتھیوں کو لے کر شام کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد ایک سخت زلزلہ آیا اور ساری قوم اس کی لپیٹ میں آکر بری طرح ہلاک ہوگئی۔

ایک آیت

سورہ لقمان کے آخر میں ارشاد ہوا ہے: بیشک قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اور وہی بارش اتارتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔

جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قیامت کی ساری تفصیلات انسان کے علم میں نہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں۔ ہم اپنی بشری محدودیت کی وجہ سے ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ پھر بھی کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرتا۔ زندگی کے تمام معاملات اسی قسم کی "ناکافی" معلومات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی معلومات کو قیامت کے انکار کے لئے معقول وجہ مان لینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

بارش آتی ہے اور آنے والی ہے، مگر انسان کو قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی آج بھی محکمۂ موسمیات اس معاملہ میں اتنا ہی عاجز ہے جتنا قدیم دور کا انسان اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا۔

عورت حاملہ ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جننے والی ہے۔ مگر کیا جنے گی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پیدا ہونے والا کتنی مدت تک دنیا میں رہے گا اور کب مر جائے گا۔ وہ کیا کمائے گا۔ وہ برا نکلے گا یا بھلا۔ وہ دوسروں کو کیا دے گا اور خود کیا حاصل کرے گا۔ اندر کا انسان باہر آکر کیا ثابت ہو گا۔ یہ سب باتیں لامعلوم رہتی ہیں۔ پھر بھی انسان یقین رکھتا ہے کہ عورت کے پیٹ سے ایک جان ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ مذکورہ عدم واقفیت کو اس کے انکار کی وجہ نہیں بنا لیتا۔

کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کچھ حاصل کرے گا۔ آدمی پروگرام بناتا ہے مگر اس کی تکمیل ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے۔ مگر اس کا منصوبہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا، اس کو کوئی نہیں جانتا۔

موت ہر ایک کے لئے یقینی ہے۔ مگر کون شخص کہاں مرے گا اور کہاں اپنی کتاب زندگی کا آخری صفحہ لکھے گا، اس کے بارے میں کوئی بھی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ کب، کیا، کتنا اور کہاں کے سوالات جن کو لوگ قیامت کے انکار کے لئے بنیاد بناتے

ہیں، ٹھیک انہیں سوالات کی موجودگی میں دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نظام چلاتے ہیں ۔ پھر اسی قسم کی کمتر واقفیت کی بنا پر قیامت کے بارے میں کیوں شبہہ کیا جانے لگے ۔

اور اللہ ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے ۔ (وَیعلمُ مافی الارحام) اس آیت کی تفسیر عام طور پر یہ مشہور ہوگئی ہے کہ یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی ۔ مگر آیت کے الفاظ میں اس تفسیر کی کوئی بنیاد موجود نہیں ۔

آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں ۔ " رحم کے اندر کیا ہے ، یہ خدا ہی کو معلوم ہے "۔ ان الفاظ میں ہر وہ بات آسکتی ہے جو پیدا ہونے والے کی زندگی اور مستقبل سے متعلق ہو ۔ یہاں ایسا کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مذکر اور مؤنث کے ساتھ خاص کیا جائے ۔

جہاں تک قرآن کی قدیم تفسیروں کا تعلق ہے ۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو باتیں کہی جاتی رہی ہیں ۔ یہاں ہم صرف ایک تفسیر کا حوالہ نقل کرتے ہیں ۔

(ویعلم مافی الارحام) أی من ذکر او انثی ، خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے ، یعنی مذکر شقی او سعید صفوۃ التفاسیر، محمد علی الصابونی یا مؤنث ، برا یا بھلا ۔

اس آیت میں مذکر اور مؤنث کا قصہ زیادہ تر عوامی ذوق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے ۔ عوام کو چونکہ اس سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پیدا ہونے والی اولاد لڑکا ہے یا لڑکی ، اس لئے یہ تفسیر مشہور ہوگئی ۔ ورنہ خود قدیم تفاسیر میں شقی اور سعید کے الفاظ بھی موجود ہیں ۔ یعنی یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ پیدا ہونے والا بڑا ہو کر برا نکلے گا یا بھلا ثابت ہوگا ۔ "برا اور بھلا" کے الفاظ انتہائی عام اور وسیع ہیں ۔ ان میں انسان کی زندگی سے متعلق ہر بات موجود ہے ۔ انسان زیادہ عمر کو پہنچ کر جو کچھ بنتا ہے وہ سب ان دو لفظوں میں شامل ہے ۔

مذکر اور مؤنث کے بارہ میں پہلے بھی انسان اندازے کرتا تھا اور موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہوگیا ہے ۔ تاہم اصل بات بدستور انسان کے لئے لامعلوم ہے ۔ اور وہ یہ کہ مکمل معنوں میں پیدا ہونے والے کے بارہ میں پیشین گوئی کی جائے کہ وہ کیسا عورت یا مرد ثابت ہوگا اور کیسا عورت یا مرد ثابت نہیں ہوگا ۔ رحم مادر کا یہ راز اب بھی انسان کے لئے لامعلوم ہے ۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. D(DN) No. 532 Issue No. 81

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)

Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱ - تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ ۵۰/
۲ - الاسلام ۱۵/۰
۳ - مذہب اور جدید چیلنج ۲۰/۰
۴ - ظہورِ اسلام ۲۰/۰
۵ - احیاءِ اسلام ۱۲/۰
۶ - پیغمبرِ انقلاب ۲۰/۰
۷ - دین کیا ہے ۲/۰
۸ - قرآن کا مطلوب انسان ۵/۰
۹ - تجدیدِ دین ۳/۰
۱۰ - اسلام دینِ فطرت ۳/۰
۱۱ - تعمیرِ ملت ۳/۰
۱۲ - تاریخ کا سبق ۳/۰
۱۳ - مذہب اور سائنس ۵/۰
۱۴ - عقلیاتِ اسلام ۳/۰
۱۵ - فسادات کا مسئلہ ۲/۰
۱۶ - انسان اپنے آپ کو پہچان ۱/۰
۱۷ - تعارفِ اسلام ۲/۵۰
۱۸ - اسلام پندرھویں صدی میں ۲/۰
۱۹ - راہیں بند نہیں ۳/۰
۲۰ - ایمانی طاقت ۳/۰
۲۱ - اتحادِ ملت ۳/۰
۲۲ - سبق آموز واقعات ۳/۰
۲۳ - زلزلۂ قیامت ۴/۰
۲۴ - حقیقت کی تلاش ۳/۰
۲۵ - پیغمبرِ اسلام ۴/۰
۲۶ - منزل کی طرف ۹/۰
۲۷ - حقیقتِ حج (زیرِ طبع)
۲۸ - Mohammad The Ideal Character 3/-

تعارفی سٹ

۲۹ - سچا راستہ ۱/۰
۳۰ - دینی تعلیم ۳/۰
۳۱ - حیاتِ طیبہ ۲/۵۰
۳۲ - باغِ جنت ۳/۰
۳۳ - نارِ جہنم ۳/۰

مکتبہ الرسالہ ☐ جمعیۃ بلڈنگ ☐ قاسم جان اسٹریٹ ☐ دہلی ۶